مقتدر سماجی طبقات کے استحصالی رویے: معاصر اردو ناول میں افسر شاہی کی قباحتوں کی عکاسی کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

طیبہ بتول

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۲۲ء

مقتدر سماجی طبقات کے استحصالی رویے: معاصر اردو ناول میں افسر شاہی کی قباحتوں کی عکاسی کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

طیبہ بتول

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان وادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۲۲ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: مقتدر سماجی طبقات کے استحصالی رویے: معاصر اردو ناول میں افسر شاہی کی قباحتوں کی عکاسی کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ

پیش کار: طیبہ بتول **رجسٹریشن نمبر:** 1731/M/U/F19

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر عابد حسین سیال _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

پروفیسر ڈاکٹر عامر اعجاز _____

پرو ریکٹر اکیڈمکس

تاریخ: _____

اقرار نامہ

میں، طیبہ بتول حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کی ایم۔فل (اردو) سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عابد حسین سیال کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ ہی آئندہ کروں گی۔

طیبہ بتول

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرست ابواب	v
Abstract	viii
اظہار تشکر	ix
باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	1
الف۔ تمہید	1
i. موضوع کا تعارف	1
ii. بیان مسئلہ	3
iii. مقاصد تحقیق	4
iv. تحقیقی سوالات	4
v. نظری دائرہ کار	4
vi. تحقیقی طریقہ کار	6
vii. مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق	7
viii. تحدید	8
ix. پس منظری مطالعہ	8

x. تحقیق کی اہمیت 9

ب۔افسر شاہی نظام: مفہوم اور ارتقائی صورت 10

i. افسر شاہی کا تعارف 10

ii. افسر شاہی کی خوبیاں 26

iii. افسر شاہی کی قباحتیں 31

1۔نظام میں قباحتیں 31

2۔افراد کی بد عنوانی 32

ج۔اردو ناول میں افسر شاہی کی قباحتوں کی عکاسی کی روایت 40

حوالہ جات 48

باب دوم۔افسر شاہی میں نظام کی قباحتیں اور معاصر اردو ناول میں ان کی عکاسی 51

الف۔افسر شاہی میں نظام کی قباحتیں 51

i. افسروں کو ان پڑھ سیاسی لوگوں کے ماتحت کرنا 51

ii. نظام کی سست روی 52

iii. فائلوں کے گورکھ دھندے 55

ب۔معاصر اردو ناول میں ان قباحتوں کی عکاسی کا مطالعہ 56

''پری'': (افسروں کو ان پڑھ سیاسی لوگوں کے ماتحت کرنا، نظام کی سست روی)

''منتارا'': (نظام کی سست روی، فائلوں کے گورکھ دھندے)

''کرک ناتھ'': (نظام کی سست روی، فائلوں کے گورکھ دھندے)

حوالہ جات 87

باب سوم: افسر شاہی میں افراد کی بد عنوانی اور معاصر اردو ناول میں اس کی عکاسی 90

الف۔ افراد کی بد عنوانی کی صورتیں 90

i. رشوت 90

ii. سفارش 95

iii. اقربا پروری 100

iv. سازش 100

ب۔ معاصر اردو ناول میں ان بد عنوانیوں کی عکاسی کا مطالعہ 106

''کرک ناتھ'':(رشوت، سازش)

''منتارا'':(اقربا پروری، سازش)

''پری'':(سفارش)

حوالہ جات 143

باب چہارم: مجموعی جائزہ، تحقیقی نتائج، سفارشات 147

الف۔ مجموعی جائزہ 147

ب۔ تحقیقی نتائج 161

ج۔ سفارشات 162

کتابیات 165

ABSTRACT

Bureaucracy in Pakistan,is basically a product of the colonial system.Before the partition of India,British officers and employees of the British Empire and the East India Company began to exploit the natives.They did this through the 'facilitators',bureaucracy may be considered as one of those. Pakistani society is also struggling with this system and the remnants of the British.

Literature tells the story of the relationship between life and society,economic and material development,class society,politics and its necessity.Literature has been called the mirror of society.Novel,due to its relatively direct narration,is closer to life as compared to other genres of literature and its scope is wider .Contemporary novelists have artistically expressed the contemporary problems, issues, corruptions found in the society,misbehavior,political and social exploitation and individual and collective miseries. The research ia a study of the depiction of bureaucratic evils in contemporary Urdu novels regarding the exploitative attitudes of the dominant social classes.Three novels have been selected for this study including Muhammad Hafeez Khan's 'Mantara' (2021) and 'Kariknath' (2020) and Khalid Fateh Muhammad's 'Pari' (2006).

اظہارِ تشکر

اس ذاتِ باری تعالیٰ کی شکر گزار ہوں کہ جس نے مجھے نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد جیسی عظیم درسگاہ کے خزینہ علمی سے مستفید ہونے کا شرف بخشا اور ایم۔فل کی سطح پر زیرِ نظر تحقیقی مقالہ لکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس عظیم درسگاہ کے قابلِ احترام اساتذہ کرام نہ صرف درس وتدریس میں بے مثال ہیں بلکہ ان کا حسنِ خلق خصوصی طور پر طلباء کے ساتھ ان کا مشفقانہ رویہ اپنا ثانی نہیں رکھتا۔

والدین اور اساتذہ کرام کی شفقتیں اور عنایتیں انمول ہیں تاہم مقالے کے تکمیلی مراحل کو طے کرنے کے سلسلے میں میں ان کی سرپرستی کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں خصوصاً اپنے نگرانِ مقالہ ڈاکٹر عابد حسین سیال صاحب کی شفقتوں اور رہنمائی کی احسان مند ہوں۔ جنہوں نے لمحہ بہ لمحہ میری رہنمائی کی اور صبر آزما مرحلے میں میری ہمت افزائی کی۔ دیگر اساتذہ کرام کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے تحقیقی و تنقیدی شعور عطا کیا اور ان کی بدولت میرے علمی شعور کی کئی شمعیں روشن ہوئیں۔ ان قابلِ عزت و تکریم اساتذہ میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کی صدرِ شعبہ ڈاکٹر فوزیہ اسلم صاحبہ، ڈاکٹر نازیہ یونس صاحبہ، ڈاکٹر صنوبر الطاف صاحبہ، ڈاکٹر نعیم مظہر صاحب، ڈاکٹر محمود الحسن صاحب، ڈاکٹر رخشندہ مراد صاحبہ، ڈاکٹر نازیہ ملک صاحبہ، ڈاکٹر صوبیہ سلیم صاحبہ، ڈاکٹر تبسم عنبرین شاکر صاحبہ، ڈاکٹر بشریٰ پروین صاحبہ اور دیگر اساتذہ کرام شامل ہیں، شعبہ اردو کی کوآرڈینیٹر ڈاکٹر صائمہ نذیر صاحبہ کی بھی تہہ دل سے ممنون ہوں جن کا وجود شعبہ اردو میں اس گھنے درخت کی مانند ہے جس کی چھاؤں میں ستانے کے لیے مسافر کچھ دیر ٹھہر جاتے ہیں۔ میں اپنے ان احباب کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے اس تحقیقی سفر میں میری ہر طرح سے معاونت کی خصوصاً جمشید عالم صاحب، محمد حفیظ خان صاحب، خالد فتح محمد صاحب جنہوں نے اپنے ذاتی کتب خانے سے مواد اور کتب کی فراہمی کو سہل بنایا۔ اپنے ہم جماعتوں کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے بھائیوں کی طرح میری رہنمائی کی۔ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد میں گزارا ہوا تمام وقت خوبصورت یادوں کا ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ یہاں سے حاصل کیا جانے والا علم، اعتماد اور قابلِ صد احترام اساتذہ کا خلوص میرے سفرِ زیست میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

طیبہ بتول (ایم۔فل اردو اسکالر)

باب اول:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید:

ا۔ موضوع کا تعارف:

تحقیق ہذا کا مجوزہ عنوان: ''مقتدر سماجی طبقات کے استحصالی رویے: معاصر اردو ناول میں افسر شاہی کی قباحتوں کی عکاسی کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ'' ہے۔ تحقیقی مقالہ اسی کو پیش نظر رکھ کر پیش کیا گیا ہے۔

اس نسق زیست میں ''سماج''(Society) کی اہمیت مسلمہ ہے۔انسانی تہذیب کا جائزہ لینے سے یہ امر عیاں ہوتا ہے کہ سماج کا جب وجود ہوا تو اس وقت تک طبقات کا کوئی تصور نہیں تھا۔تاہم جیسے جیسے انسانی سماج طبقاتی سماج میں بٹنے لگا تو انسانی سماج کے وجود کا دار و مدار مادی دولت کی پیداوار پر منحصر ہو گیا۔اس تقسیم کو سماجی نابرابری یا طبقاتی سماج (Social Stratification) کہا گیا اور سماج میں استحصال، قتل و غارت گری کا آغاز ہوا۔دولت، طاقت اور اقتدار کی بدولت طاقتور طبقے نے کمزور طبقوں کو دبانا شروع کیا۔اس ضمن میں تھامس ہابس(Thomas Hobbes) نے اپنی کتاب ''Leviathan or The Matter,Form and Power of a Common Wealth,Ecclesiastical and Civil'' میں اس استحصال اور طبقاتی کشمکش کو بیان کیا ہے۔اسی طرح ژاں ژاک روسو(Jean-Jacques Rousseau) نے اپنی کتاب ''The Social Contract:or The Principles of Political Rights'' میں بھی طبقاتی سماج کی قباحتوں کی عکاسی کی ہے۔اس کے متعلق مختلف مفکرین اور فلسفیوں نے اپنے نظریات پیش کیے ہیں جن میں مابعد نوآبادیات کا نظریہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

نوآبادیاتی صورت حال کے اختتام اور ممالک کی آزادی کے باوجود غلامی اور نوآبادیاتی آثار ختم نہیں ہوئے کیونکہ نوآبادیاتی دور کے اثرات اتنے ہمہ گیر تھے کہ مغلوب ممالک کے سماج اور سسٹم میں پنجے کی طرح گڑے ہوئے تھے۔چنانچہ برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے باوجود لوگ مکمل آزادی سے محروم

ہیں۔ نوآبادیاتی ہتھکنڈوں کے بعد بھی مابعد نوآبادیاتی دور میں ان کا استحصال ہو رہا ہے۔ آزادی کے حصول کے بعد بھی مصلحت کے نام پر منافقت، اقتدار کے نام پر عوام کو مغلوب کرنا اور ان جیسے حالات کا سامنا ہے۔ پاکستانی معاشرے میں جو مقتدر طبقات زیادہ فعال نظر آتے ہیں وہ سیاسی اقتدار کے حامل لوگ (People with Political Authority)، معاشی اقتدار کے حامل لوگ (People with Economic Authority) اور سرکاری افسران (Bureaucracy) پر مشتمل ہیں۔ اگر ہم پاکستان کے سیاسی منظر نامے پر نظر ڈالیں تو عام آدمی کی معاشی خوشحالی، مزدوروں کے استحصال کے خاتمے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اہل اقتدار ایسے قوانین وضع کرتے اور ملک کی معیشت چلاتے ہیں جو اسٹیبلشمنٹ، سول اور فوجی بیوروکریسی کے مفادات کے تابع ہو۔ اسی بنا پر ہماری معاشی بدحالی کی ذمہ داری ہمارے موجودہ سیاسی ڈھانچے پر عائد ہوتی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی سرمایہ دار طبقہ ہے جو اپنے سرمایہ کے زور سے حکومتی پالیسی کو اپنی حکمت عملی کے تابع کر لیتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام جس میں Accumulation of wealth کا تصور ہے، دولت کی اس ریل پیل میں دولت کا بہاؤ ہر حال میں عوام الناس سے خاص الخواص (سرمایہ داروں) کی جانب ہی رہتا ہے۔ یوم مئی کی جدوجہد نے یہ باور کرادیا کہ سرمایہ داری نظام استحصالی ہے۔ سرمایہ داروں اور افسر شاہی کے گٹھ جوڑ سے سرمایہ دارانہ حکومتیں ایسے ہی اصول ''عدم مداخلت'' (Laissez-fair) سے انحراف کر کے مختلف قوانین اور ناجائز ٹیکسوں کے ذریعے کسی کی ہمت افزائی اور کسی کی حوصلہ شکنی کرتی رہتی ہیں۔ حالانکہ تمام عالم میں بیوروکریسی (افسر شاہی) کا بنیادی مقصد حکومت وقت کے قواعد وضوابط کو بھرپور لگن اور دیانتداری سے نافذ کرنا ہوتا ہے۔

افسر شاہی (Bureaucracy) بنیادی طور پر نوآبادیاتی نظام کی پیداوار ہے۔ تقسیم ہند سے قبل برطانوی سامراج اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز افسران اور ملازمین نے تجارت کی شکل میں مقامی لوگوں کا استحصال شروع کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ''لوگو'' دو خونخوار شیروں پر مشتمل تھا جس کا علامتی مقصد ہندوستان کے لوگوں کا خون چوسنا، ان کا گوشت اور ہڈیاں چبانا اور کمزور انسانوں کا استحصال کرنا تھا۔ سو اس نے یہ کام بیوروکریسی کے ''سہولت کاروں'' کے ذریعے انجام دیا اور آج بھی اس نظام اور انگریزوں کی باقیات سے پاکستانی معاشرہ نبرد آزما ہے۔

ادب (Literature) زندگی اور سماج کے تعلق، اقتصادی اور مادی ترقی، طبقاتی سماج، سیاست اور

اس کی ضرورت ابتدا سے اب تک انسانی فسادات کی کہانی ہے۔ادب کو سماج کا آئینہ کہا گیا ہے۔انسان نے جب بھی اپنے خیالات کو رواج دینا چاہا،اپنی الجھنوں (چاہے وہ روحانی ہو یا مادی) کا تذکرہ کیا تو وہ ادب میں شامل کر لیا گیا۔ادب اور سماجی حالات کی عکاسی کے اس تال میل میں ''ناول''(Novel)مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔کیونکہ ناول تمام اصناف ادب میں زندگی کے قریب تر ہے اور اس کا پیرائیہ اظہار وسیع تر۔تمام ناول نگاروں نے دور حاضر کے مسائل،معاملات،معاشرے میں پائی جانے والی بدعنوانیوں،بے راہ رویوں،سیاسی و سماجی استحصال اور انفرادی واجتماعی حادثات کو فنکارانہ انداز سے اپنی تخلیقات میں اجاگر کیا ہے۔

تحقیق ہذا بنیادی طور پر مقتدر سماجی طبقات کے استحصالی رویوں کے حوالے سے معاصر اردو ناول میں افسر شاہی کی قباحتوں کی عکاسی کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ ہے۔اس مطالعہ کے لیے تین ناولوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔یہ ناول ''محمد حفیظ خان''کا ''منتارہ''(۲۰۲۱ء)،''کرک ناتھ''(۲۰۲۰ء)،''خالد فتح محمد''کا''پری''(۲۰۰۶ء)ہیں۔

مقالہ ہذا انہی تین ناولوں کی افسر شاہی کی قباحتوں کی عکاسی کے حوالے سے تنقیدی و تحقیقی کاوش ہے۔

۲۔بیان مسئلہ:

معاشرے کے بگاڑ میں متعدد عوامل،طبقات اور اداروں کی کارفرمائی عمومی طور پر منظر عام پر آتی ہے۔ان میں سے ایک بنیادی ادارہ افسر شاہی کا ہے۔بنیادی طور پر یہ شعبہ خدمت گار کے طور پر بنایا گیا ہے۔اس زاویے سے فکشن نگار بھی اس کو پیش کرتے ہیں کیونکہ ناول نہ صرف داخلی تصادم اور اس کے محرکات کو اپنی گرفت میں لیتا ہے بلکہ معاشرہ،فرد اور ذات کے خارجی عوامل و عناصر کو پیش کرتا ہے۔اکیسویں صدی کے معاصر اردو ناول میں جیتے جاگتے تازہ ترین مسائل،دور حاضر کی سماجی اور معاشی گتھیاں،زندگی کی نئی الجھنیں،انسان کی نفسیاتی کمزوریاں نئے اور منفرد انداز میں در آئی ہیں۔میڈیا کا پھیلتا جال،پاکستان کی مخصوص سیاست اور اس کا بحران،سیاسی اور معاشرتی کرپشن،اقدار کی پامالی،افسر شاہی کی بدعنوانیاں اور ہوس کی اجارہ داری جیسے موضوعات ان ناولوں میں موجود ہیں جس میں زندگی کی پوشیدہ تلخ اور کھردری حقیقتوں کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔تاہم یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ناول نگار اس امر کی عکاسی کس طرح کر رہا ہے اور مزید یہ کہ واقعی یہ معاملہ اتنی ہی شدت رکھتا ہے جتنا عام طور پر سمجھا اور پیش کیا جاتا ہے۔

۳۔مقاصد تحقیق:

مجوزہ مقالے میں درج ذیل تحقیقی مقاصد پیش نظر رہے ہیں:

۱۔اردو ناول میں افسر شاہی میں نظام کی قباحتوں کی عکاسی کا تعین کرنااور اس کی صورتیں دریافت کرنا۔

۲۔معاصر اردو ناول میں افسر شاہی میں نظام کی قباحتوں کی عکاسی کا تجزیہ و تفہیم کرنا۔

۳۔معاصر اردو ناول میں افسر شاہی میں افراد کی بد عنوانی کی عکاسی کا مطالعہ کرنا۔

۴۔ تحقیقی سوالات:

مجوزہ تحقیق میں درج ذیل سوالات مد نظر رکھے گئے ہیں:

۱۔معاصر اردو ناول میں افسر شاہی میں نظام کی قباحتوں کی عکاسی کیسے کی گئی ہے اور اس کی مختلف صورتیں کیا ہیں؟

۲۔معاصر اردو ناول میں افسر شاہی کی عکاسی میں نظام کی قباحتوں کی پیشکش کیسی ہے؟

۳۔معاصر اردو ناول میں افسر شاہی میں افراد کی بد عنوانی کی پیش کش کی نوعیت اور صورتیں کیا ہیں؟

۵۔ نظری دائرہ کار:

معاشرے میں مقتدر طبقات کے استحصالی رویوں کے متعلق مختلف مفکرین اور فلسفیوں نے اپنے نظریات پیش کیے ہیں جن میں ''مابعد نو آبادیات''(Post-Colonialism)کا نظریہ بہت اہم گردانا جاتا ہے۔ مغربی دنیا میں نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی تنقید کے حوالے سے کچھ اہم ستون ہیں جنھوں نے تنقیدی نظریات اور اصطلاحات کی نئی جہات دریافت کی ہیں۔ان ناقدین میں اہم شخصیت ''ایڈورڈ سعید''(Edward Said)ہے۔اس اصطلاح اور نظریے کو ایڈورڈ سعید کی ۱۹۷۸ء میں شائع ہونے والی کتاب''Orientalism''سے منسوب کیا جاتا ہے۔لیکن ان سے کہیں پہلے ''ایمی سیز ائر''(۲۰۰۸ء۔۱۹۱۳ء)اور''فرانز فینن''(Frantz Fanon)نے یہ تصور اور اس کے نتائج کو پیش کیا تھا۔فرانز فینن کی کتاب''Wretched of the earth''کا سنہ ۱۹۶۹ء میں محمد پرویز اور سجاد باقر رضوی نے ''افتادگان خاک'' کے نام سے اردو ترجمہ کیا جس کا نیا ایڈیشن ۱۹۹۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔اسی طرح

جدید تنقیدی نظریات میں ایک فرانسیسی مفکر،ادیب،تاریخ دان اور تنقید نگار مشل فوکو (Michel Foucault) کا نام بھی شامل ہے۔ مشل فوکو نے اپنی ایک کتاب ''ضابطہ اور سزا'' (Discipline and Punish) میں اقتدار اور طاقت کی کئی صورتوں کا تذکرہ کیا ہے،علاوہ ازیں انھوں نے نو آبادیات اور مابعد نو آبادیات پر کام کیا۔اسی سلسلے کی ایک اور کڑی ''ہومی کے بھابھا'' ہیں۔جنھوں نے صاحب اثر نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی نظریات اور اصطلاحات بیان کرنے کی بنا پر شہرت حاصل کی۔یوں استحصالی رویے اور طبقاتی کشمکش یہ سفر طے کرتے ہوئے اردو میں پہنچے۔افسر شاہی کے حوالے سے زیادہ تر نقاد اسے ایک استحصالی رویہ قرار دیتے ہیں۔اردو میں حسین محی الدین قادری، میاں منیر احمد اور قیصر امین الدین نے افسر شاہی پر نظری و اطلاقی مضامین تحریر کیے۔اسی حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے ۲۰۱۳ء میں ''مابعد نو آبادیات: اردو کے تناظر میں'' کے نام سے ایک کتاب تحریر کی۔جس میں افسر شاہی (Bureaucracy) کے استحصالی رویے کو مفصل بیان کیا گیا۔متذکرہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔باب دوم میں نو آبادیات میں علم اور طاقت کے تصورات،دونوں کے مفاہیم،دائرہ ہائے عمل اور افسر شاہی کی پیچیدگیوں کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے،اس ضمن میں وہ رقمطراز ہیں:

> ''ہر چند ہندستان میں ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک انگریزوں نے اور مقامی آبادی کے ہزاروں افراد قتل اور قید ہوئے، مگر یہاں انگریزوں نے اجتماعی نسل کشی کے بجائے طاقت کے استعمال کی ایک اور صورت دریافت کی۔یہ صورت انوکھی مگر پوری طرح کارگر تھی۔۳۰ کروڑ آبادی کے ہندستان پر صرف چند ہزار برطانوی سول ملازمین نے نو آبادیاتی قبضہ کیے رکھا۔۱۹۳۰ء تک ان سول ملازمین کی کل تعداد صرف ۴۰۰۰ تھی۔جنھوں نے ۶۰۰۰۰ فوجی اور ۹۰۰۰۰ دیسی ملازمین بھرتی کیے ہوئے تھے۔آخر کیسے ایک عظیم عددی اکثریت، معمولی اقلیت کے تابع فرمان تھی؟نو آبادیاتی تاریخ کے اس اہم ترین سوال کا جواب بے حد سادہ ہے: طاقت کو سماجیانے کا عمل۔''

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے درج بالا تصور کے تناظر میں مجوزہ تحقیق میں ''معاصر اردو ناول میں افسر شاہی کی قباحتوں کی عکاسی کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ'' کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے اور اسی نظریے سے استفادہ کرتے ہوئے

اردو میں پیش کردہ مضامین کی تفہیمات و تعبیرات سے رجوع کیا گیا ہے اور منتخبہ تینوں ناولوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار:

تحقیق ہذا بنیادی طور پر تحقیقی اور تنقیدی یعنی امتزاجی نوعیت کی ہے۔اس تحقیق کا اساسی ڈھانچہ تحقیق کے اصول اور ضوابط پر ہی ترتیب دیا گیا ہے اور ادبی تحقیق میں رائج ''نمونہ جاتی''(Sampling) کے طریقہ ہائے کار کو برتا گیا ہے۔یہ تحقیقی طریقہ دراصل دستاویزات کی پرکھ، بیان اور ان سے اخذ کردہ نتائج سے مشروط ہے۔لہذا ابتدائی سطح پر منتخبہ تینوں ناولوں پر مبنی تنقیدی مضامین کی ورق گردانی کی گئی جس سے نتیجے کے طور پر مقتدر سماجی طبقات کے استحصالی رویوں کی مختلف صورتیں سامنے آئیں ان میں سے ایک ''افسر شاہی''(Bureaucracy) کی سوچ اور رویہ ہے۔اس موضوع، بیان اور ان دستاویزات کو پرکھنے کے لیے منتخبہ ناولوں کا مطالعہ کیا گیا تو نظام کی قباحتوں اور افراد کی بدعنوانی عکاسی کی جھلک ناولوں میں موجود تھی۔موضوع سے متعلق مواد کی جمع آوری اور ترتیب کے بعد تجزیاتی طریقہ اختیار کیا گیا بعد ازاں منتخبہ معاصر ناولوں سے موضوع سے متعلقہ حصوں کو نشان زدہ کیا گیا اور مجوزہ موضوع سے متعلق واقعات، کرداروں اور استحصال کی مختلف صورتوں کو الگ الگ کیا گیا۔ڈیٹا اکٹھا کرنے کے بعد اس کی تقسیم کا مرحلہ آتا ہے لہذا وہ تمام واقعات ، کردار یا استحصال کی صورتیں جن میں ''افسر شاہی''(Bureaucracy) سے متعلقہ نظام کی قباحتوں اور افراد کی بدعنوانی کی عکاسی کی گئی ہے ان کو الگ الگ کیا گیا۔مجوزہ تحقیق کے آخری مرحلے میں معلومات، تصورات، نظریات، تاثرات اور شواہد کو جمع کر کے آخر میں نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

ان بنیادی مآخذ کے ساتھ ساتھ متعلقہ ثانوی مآخذ جو کہ اردو تحقیقی و تنقیدی کتب، تحقیقی مقالات، ریسرچ پیپرز، رسائل و جرائد، انگریزی کتب، اردو لغات اور ویب گاہوں سے رجوع کرتے ہوئے آراستہ کیا گیا ہے۔ان بنیادی و ثانوی مآخذ تک رسائی کے لیے پاکستان کے چند اہم کتب خانوں ''بک کارنر جہلم، انجمن ترقی اردو کراچی، سنگ میل پبلیکیشنز لاہو، ادارہ فروغ قومی زبان اسلام آباد'' سے رجوع کرنے کے ساتھ ساتھ انڈیا کے انتہائی اہم ادبی کتب خانے ''ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی'' سے برقی رابطے اور ڈاک کے ذریعے رابطہ قائم کر کے استفادہ کیا گیا۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:

اردو ناول نگاری میں افسر شاہی کے حوالے سے جامعاتی سطح پر اردو ناول نگاری کا ایسا مطالعہ یا تحقیق اس سے پہلے نہیں کی گئی۔ تاہم انفرادی سطح پر اس موضوع سے متعلقہ کتب اور مضامین شائع کئے گئے ہیں۔ اردو ناول نگاری میں ہندوستان اور پاکستان میں جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے مسائل اور مناظر، نوآبادیاتی تمدن کے اثرات، اردو ناولوں میں کسانوں اور مزدوروں کے مسائل کے حوالے سے ایم۔ فل کی سطح پر کام ہو چکا ہے لیکن مقالہ جات میں افسر شاہی کے تحت پیدا ہونے والے مسائل کو زیر بحث نہیں لایا گیا۔ مجوزہ مقالے میں منتخبہ ناول نگاروں کے چنیدہ ناولوں کو اس موضوع کے حوالے سے پرکھا گیا۔

۱۔ سارہ طارق، مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی (اردو)، اردو ناول میں جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے مظاہر، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۱ء

۲۔ ریاض حسین، مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی، اردو ناول پر نوآبادیاتی تمدن کے اثرات، شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

۳۔ صالحہ زرین، ڈاکٹر، مقالہ برائے پی، ایچ، ڈی (اردو)، اردو ناول کا سیاسی و سماجی پس منظر: ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک، الہ آباد یونیورسٹی، اتر پردیش، بھارت، ۱۹۹۷ء

۴۔ محمد فاروق انصاری، ڈاکٹر، مقالہ برائے پی، ایچ، ڈی، سیاسی موضوعات پر مبنی اردو ناولوں کا تنقیدی مطالعہ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی، ۱۹۹۰ء

۵۔ ایس قادر بادشاہ، مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی، اردو ناولوں میں سماجی مسائل، سری وینکٹیشور یونیورسٹی، آندھرا پردیش

۸۔ تحدید:

اکیسویں صدی کے متعدد ناولوں میں افسر شاہی نظام کے عناصر کو بیان کیا گیا ہے جس کا تجزیہ مکمل طور پر ایک مقالے میں پیش کرنا قدرے مشکل کام ہے۔ اس لیے مقالے کی تحدید کے پیش نظر اکیسویں صدی میں سامنے آنے والے مخصوص پاکستانی ناولوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ بیسویں صدی میں لکھے جانے والے ناول اس کے دائرہ کار میں نہیں آئے۔ منتخب ناولوں کو افسر شاہی نظام کے تناظر میں جانچا گیا ہے۔ ان ناولوں کے دیگر فکری و

فنی پہلو تحقیق کا حصہ نہیں ہیں۔ مطالعہ ہذا میں ان تین منتخبہ ناولوں کے علاوہ معاصر دور انیے ۲۰۰۰ء تا ۲۰۲۱ء کا کوئی بھی اور ناول اس مطالعے میں زیر تحقیق نہیں لایا گیا۔

۹۔ پس منظری مطالعہ:

معاصر اردو ناول میں افسر شاہی کی قباحتوں کی عکاسی ایک نیا زاویہ تحقیق ہے۔ جس کے حوالے سے تا حال محدود پیمانے پر کچھ کام سامنے آیا ہے۔ افسر شاہی کی تفہیم اور قباحتوں کی عکاسی کے لیے تنقیدی کتب اور مضامین کا مطالعہ کیا گیا اور مختلف مقالہ جات ملکی و غیر ملکی سے بھی استفادہ کیا گیا۔ مزید براں منتخب کردہ ناولوں پر جدید تنقیدی کتب اور ناولوں کا مطالعہ کیا گیا۔ تاہم اس حوالے سے منتخب اخبار اور رسائل کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے۔ اس ضمن میں تا حال جو تحقیق سامنے آئی ہے اس میں توقیر عباس کا ایک مضمون ''خالد فتح محمد کے ناول پری کا ایک جائزہ'' مشمولہ ہفت روزہ، الحبیب۔ جلد نمبر ۲۹، شمارہ نمبر ۱۵، ۷ فروری ۲۰۰۷ء ہے۔ جس میں انھوں نے ناول میں موجود معاشرتی سطح پر اور کرداروں میں موجود اضطراب و انتشار کو نمایاں کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے سیاسی حکمرانوں پر فوج کے بیشمار دباؤ کو جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ اشفاق نقوی نے اپنے ایک مضمون ''Languages that make literature'' جو کہ Dawn,Lahore, Monday,February12,2007 میں شائع ہوا، اس میں خالد فتح محمد کی ناول نگاری اور ناول ''پری'' کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر انعام سعید نے اپنے مضمون ''خالد فتح محمد کے ناول پری پر ایک گفتگو'' مطبوعہ رسالہ ماہنامہ، ادب دوست، جلد نمبر ۱۳، شمارہ نمبر ۳، مارچ ۲۰۰۷ء لاہور میں ناول میں موجود ہر پہلو کی بھرپور عکاسی کی ہے اور وقت کی بدلتی ہوئی رفتار میں انسانی، نفسیاتی اور فلسفیانہ نظروں کے حوالے سے بحث کی ہے تاہم افسر شاہی کے موضوع کو زیر بحث نہیں لایا گیا۔ اسی حوالے سے محمد احمد قاضی کا ایک مضمون ''ناول پری پر ایک نظر'' مشمولہ ماہنامہ، الحمرا، لاہور، جلد نمبر ۷، شمارہ نمبر ۳، مارچ ۲۰۰۷ء میں ناول میں وہ اکسانا (Provoke) اور انجذاب (Absorption) کے معنوں میں فرق کو واضح کرتے ہیں اور انہوں نے اسی ناول کے نام ''پری'' پر بھی گہری تنقید کی ہے۔ اقبال احمد نے اپنے ایک مضمون ''پاکستان: پولیس ریاست کی نشاندہی'' میں ''زوال آمادہ افسر شاہی'' کے ذیلی عنوان کے تحت افسر شاہی نظام کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ رابعہ رحمٰن نے ایک مضمون ''افسر شاہی یا نوکر شاہی'' مطبوعہ روزنامہ نوائے وقت، اپریل ۲۰۱۴ء میں افسر شاہی نظام کی تفہیم اور تجزیہ پیش کیا ہے۔ منتخب ناول ''کرک ناتھ'' پر علی

عبد اللہ کا تبصرہ ۹ جولائی ۲۰۲۰ء کو دانش ڈاٹ کام پی۔کے کی ویب سائٹ پر منظر عام پر آیا۔ جس میں ناول کی تمام جزیات پر بحث کی ہے۔ قیصر امین الدین نے اپنی کتاب ''فکر و نظر''، ابلاغ، لاہور، فروری ۱۹۹۹ء میں ایک مضمون بعنوان ''بد عنوانی۔۔۔۔۔اسباب اور محرکات'' میں بھی افسر شاہی نظام کی قباحتوں کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

مذکورہ مضامین میں افسر شاہی نظام اور منتخب ناولوں کے بارے میں ابتدائی معلومات اور تعارف پیش کیا گیا ہے جو اس موضوع کی درست فہم عطا کرتا ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں معاصر اردو ناول میں افسر شاہی نظام کے تمام پہلوؤں کو یکجا کر کے ایک منظم، باقاعدہ اور منضبط تحقیق کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت:

انسانی زندگی میں شکست و ریخت، پیچ و خم اور انقلاب سے دوچار رہتی ہے، اس کے اظہاریے کا سب سے بہتر وسیلہ بننے کی صلاحیت اگر کسی صنف ادب میں ہے تو وہ صرف ناول ہے۔ مجوزہ تحقیقی تنقیدی زاویے پر انفرادی سطح پر اس موضوع سے متعلقہ کتب اور مضامین منظر عام پر آ چکے ہیں۔ مختلف انگریزی اور اردو زبان کے اخبارات میں افسر شاہی کے کردار (تخریبی یا تعمیری)، مقاصد، اختیارات کا استعمال، کارکردگی، زوال اور قباحتوں سے متعلق مضامین شائع ہو چکے ہیں، علاوہ ازیں افسر شاہی کے رویوں سے متعلق بھی مضامین شائع ہو چکے ہیں تاہم اس ضمن میں کتب بھی موجود ہیں۔

اکیسویں صدی کے ناولوں میں بد عنوان سیاست کی پیچیدگیوں، اقتدار کے کھیلوں اور استحصال کے بھیانک رنگوں کو تفصیل سے پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ناول کے فکری موضوعات پر مختلف زاویوں سے تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ بیسویں صدی کے حوالے سے ناول کے حوالے سے سیاسی و سماجی پہلو پر ناقدانہ نظر ڈالی جا چکی ہے۔ مگر اکیسویں صدی کے اردو ناول میں ابھی بہت سے زاویے قابل تحقیق ہیں۔ اس میں ایک افسر شاہی کا پہلو بھی ہے۔ جس کے حوالے سے شعبہ تہی دامنی کا شکار ہے۔ دور حاضر میں اخبارات، سوشل میڈیا اور دیگر ذرائع سے افسر شاہی کی بد عنوانیوں اور قباحتوں کے بارے میں سنتے چلے آ رہے ہیں۔ تاہم دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ناول نگار اس امر کی عکاسی کس طرح کر رہا ہے اور مزید یہ کہ کیا واقعی یہ معاملہ اتنی شدت رکھتا ہے جتنا عموماً سمجھا اور پیش کیا جاتا ہے۔

اردو ناول نگاری میں افسر شاہی کے حوالے سے جامعاتی سطح پر اردو ناول نگاری کا ایسا مطالعہ یا تحقیق اس سے پہلے نہیں کی گئی، اردو ناول نگاری میں ہندوستان اور پاکستان میں جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے مسائل اور مناظر، نوآبادیاتی تمدن کے اثرات، اردو ناولوں میں کسانوں اور مزدوروں کے مسائل کے حوالے سے ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کی سطح پر کام ہو چکا ہے۔ لیکن مقالہ جات میں افسر شاہی کے تحت پیدا ہونے والے مسائل کو زیر بحث نہیں لایا گیا۔ مجوزہ مقالے میں تین منتخب ناولوں کو اس موضوع کے حوالے سے پرکھا گیا ہے۔

ب۔افسر شاہی نظام: مفہوم اور ارتقائی صورت

i. افسر شاہی کا تعارف:

حکومت اور اقتدار دو سحر انگیز الفاظ ہیں۔ زندگی کی اعلیٰ درجے کی خواہشات ان پر کشش الفاظ کے سامنے سرنگوں ہیں۔ بلندیوں کی طلب اور خواہش انسانی فطرت میں سرایت کر چکی ہے لیکن فطرت کا ہر پہلو سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ پرکار بھی ہے۔ تصویر فطرت نہ صرف دو رخوں پر مشمول ہے بلکہ بے رخی بھی رخ کی ایک صورت ہے۔

غور و فکر کرنے والے انسان فطرت کے تمام رخوں کا مطالعہ و مشاہدہ کرنے کے متمنی ہوتے ہیں لیکن فطرت سے ہم آہنگی نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے ان کی فطرت سلیمہ سے آشنائی ممکن نہیں ہوتی۔ جو لوگ فطرت سلیمہ سے آشنا ہو جاتے ہیں ان کے اوصاف میں ملکوتی قوت جنم لیتی ہے اور وہ لوگ جو فطرت کے منافی چلتے ہیں ان پر فرعونیت اپنا جبر و استبداد قائم کر لیتی ہے۔

حکومت اور اقتدار کی قوت جب ملکوتی صفات سے ہم کنار ہوتی ہے تو محکوم اپنے فرماں رواؤں کو حقیقی ظل الٰہی تصور کرتے ہیں۔ بصورت دیگر اگر ہوس کی قوتیں صاحبان اقتدار پر حاوی ہو جائیں تو محکوم ہر برے امر کو آقاؤں سے منسوب کرتے ہیں۔ حکومت اقتدار کے پس پشت جذبہ خدمت ہوتا ہے یا فرعونی صدا کی بازگشت ہوتی ہے۔ یہ داستان ہر عہد میں ہر رنگ کے ساتھ گردش کرتی ہے۔ عمومی طور پر کچھ چھوٹے طبقے سے وابستہ لوگ خود کو بڑا کرنے کے لیے دوسروں کو چھوٹا کرتے دکھائی دیتے ہیں اور بعض صاحبانِ اقتدار دوسرے لوگوں

کو بڑا کرنے کے لیے خود کو سمیٹ لیتے ہیں۔اقتدار و حکومت کا بنیادی مقصد محض خدمت ہو تو اقوام عالم کا خمیر اٹھتا ہے تاہم اگر نفسانی ہوس کی تسکین مقصود ہو تو نسلوں کا ضمیر مرتا ہے۔

حکومت اور اقتدار کے ضمن میں بہت سے مقتدر طبقات موجود ہیں جن میں ایک مقتدر طبقہ افسر شاہی (Bureaucracy) ہے۔تاہم اس بیانیے کی توضیح و تشریح سے قبل اس کے مفہوم کو سمجھنا از حد ناگزیر ہے۔

افسر شاہی کے لیے انگریزی میں لفظ"Bureaucracy" مستعمل ہے جو دو الفاظ "Bureaus"اور"Kratos"کا مجموعہ ہے۔"Bureaus"فرانسیسی زبان کا لفظ ہے۔جس کے معنی ہیں"کام کی جگہ"جبکہ"Kratos"کے معنی حکومت،دستور، قاعدہ یا طریقہ کار کے ہیں۔یوں لفظ"بیورو کریسی"(Bureaucracy)متذکرہ بالا دو الفاظ کے مجموعے کی نسبت سے دستور، قواعد، طاقت اور اقتدار سے عبارت ہوتا ہے۔

> "Bureaucracy denote a government by desks or bureaus. 'Bureau'is a French word meaning'desk'Or a 'workplace' and 'kratos'is a Greek word meaning rule.These words combined together as bureaucracy describe the rule or power of desks."(1)

افسر شاہی(Bureaucracy)کی مکمل اور جامع تعریف کے حوالے سے جو مختلف معنی و مطالب اس اصطلاح کے لیے اخذ شدہ ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

ادارہ جاتی معنی:(Institutional meaning)

افسر شاہی(Bureaucracy)کی اصطلاح سرکاری افسران کی ایسی حکومت ہے جو کہ منتخب شدہ نمائندگان کی حکومت کے متوازی گردانی جاتی ہے۔اس کی وضاحت کے لیےMichael P.Barberکا نقطہ نظر انتہائی اہم ہے:

"The term "bureaucracy" may refer to government by officials as opposed to government by elected representatives."(2)

بصورت دیگر افسر شاہی کی اصطلاح یہ ظاہر کرتی ہے کہ ایک نمائندہ حکومت کا وجود قائم ہے لیکن تمام تر اقتدار اور تسلط سرکاری عہدیداران کے پاس ہے۔

متذکرہ بالا معنی و مطالب ان عمومی حالات و واقعات میں تفریق کرنے کے لیے ناکافی ہیں کہ جہاں حکومتی بالادستی منتخب شدہ، غیر منتخب شدہ اور سرکاری افسران کا مجموعہ تصور کی جاتی ہے۔

ii۔ سرکاری حکام کی سرگرمی:(Activity of Officials)

مذکورہ بالا تعریف کے برعکس مفہوم کا یہ تناظر بھی سامنے آتا ہے کہ سرکاری حکام کا طرز عمل اور طرز رویہ کس نوعیت کا ہے۔اس میں درج ذیل تشریحات و توضیحات کو سپرد قلم کیا جاسکتا ہے۔

توہین آمیز:(Derogatory)

افسر اور سرخ فیتے کی یہ مترادفاتی اصطلاح سرکاری عہدیداران کے طرز عمل کے حوالے سے حقیقی اور تصوراتی پیش آمدہ مشکلات پر منتج ہے۔

منظم نظام:(Regulated system)

ایک منظم انتظامی ڈھانچہ جو کہ پیچیدہ امور کے باہمی تعلق کے ذریعے فعال کردار ادا کرتا ہے۔

بااسلوب نظام:(Methodological system)

ان تمام طرائق کا مطالعہ جن کی بنیاد مذکورہ بالا باعث کسر شان اور منظم نظام کے ضمن میں بیان کردہ اسالیب پر ہے۔یوں افسر شاہی ایک تنظیم کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

گزشتہ صدی کے اوائل میں ایک جرمن ماہر عمرانیات(German Sociologist) نے تنظیمی ڈھانچے کو افسر شاہی(Bureaucracy) سے منسلک قرار دیا ہے۔ میکسمیلئین

ویبر (۱۸۶۴ء۔۱۹۲۰ء) ایک ماہر عمرانیات، معاشیات، تاریخ دان، ماہر سیاسیات اور ماہر فقیہ تھا۔ وہ عوامی منتظمیت اور عمرانیات کے جدید علوم کا بانی تصور کیا جاتا تھا۔ جب ویبر (Weber) نے افسر شاہی کے منظم مطالعہ کی شروعات کیں تو اس ضمن میں مشاہدات کا ایک طویل سلسلہ تیار کیا جو سرمایہ دارانہ نظام، مالیاتی معیشت اور صنعتی انقلاب جیسے تصورات پر مشمول تھا۔ ویبر کا افسر شاہی کا نظریہ کام کی تنظیمی شکل پر مشتمل ہے۔ جہاں عہدیداران اپنے افعال میں مہارت رکھتے ہیں۔ ویبر کے نزدیک افسر شاہی تسلط کی ایک صورت ہے۔ میکس ویبر (Max Weber) کسی ایسے شخص کے لیے شرائط کا قیام عمل میں لاتا ہے جو طاقت کے ساتھ اپنے جواز کا جواز پیش کرے۔

اقتدار کو قانونی حیثیت دینے کے ساتھ ساتھ طاقت کا استعمال ممکن بنانے کے لیے انتظامی تنظیم کی حد بندی ناگزیر ہے۔ میکس ویبر (Max Weber) تنظیم کی بنیاد تین عوامل پر مشتمل ہے:

ا۔ سماجی قدریں، ۲۔ انسانی قیادت، ۳۔ افسر شاہی

اس نے افسر شاہی (Bureaucracy) کی درج ذیل خصوصیات کو سپرد قلم کیا ہے:

i. امور کی تقسیم کا عمل اس طرح بروئے کار لایا جاتا ہے کہ ہر کارکن اپنے مخصوص کردہ کام کا پابند ہو جاتا ہے۔
ii. تقسیم کار اختیارات کی مختلف سطحوں کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہے جن کی درجہ بندی سطح واریوں کی گئی ہے:

اعلیٰ ترین سطح

درمیانی سطح

نچلی سطح اور مزید نچلی سطح (حسب ضرورت شامل کردہ ہیں)

iii. قواعد و ضوابط کا تعین کر دیا جاتا ہے اور ادارے سے وابستہ تمام افراد کو اپنے دائرہ کار کے مطابق متعین کردہ اصول و ضوابط کا پابند بنایا جاتا ہے
iv. تمام کارکنان قواعد و ضوابط کی رو سے روایتی اور رسمی کارگزاری کے پابند ہونے کی وجہ سے اپنے ذاتی خیالات اور پسند و ناپسند کے مطابق طریق کار میں کسی بھی تبدیلی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

میکس ویبر (Max Weber) نے سماجی سطح پر لوگوں اور اداروں کو اختیار حاصل کرنے، اس کو برقرار رکھنے اور اس سے زندگی کو متاثر کرنے کے طریقوں کی افہام و تفہیم میں اہم کردار ادا کیا۔ ویبر کے افسر شاہی کے نظریے کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے Michael P.Barber لکھتے ہیں:

> "The organization conceived by Weber is therefore designed to achieve a rational orientation towards tasks which are conducive to efficient administration."(3)

ویبر نے طاقت واقتدار اور سماجی طبقات دونوں موضوعات پر اہم نظریات پیش کیے ہیں۔ اس کے نزدیک طاقت واقتدار کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ کرشماتی اختیار (Miracle Authority) (مذہبی اختیار)

۲۔ روایتی اختیار (Traditional Authority) (خاندانی اختیار)

۳۔ قانونی اختیار (Legal Authority) (ریاستی اور انتظامی اختیار)

اب تک سماج میں تینوں طرح کے اختیارات سرگرم عمل ہیں اور کسی بھی معاشرے میں تینوں طرح کی قوتیں ناگزیر ہیں تاہم سماج نے بتدریج روایتی جاگیردارانہ اختیار کی بالادستی سے قانونی اختیار کی بالادستی کی جانب سفر طے کیا ہے۔ اس نظریے نے کلاسیکی نظریے اور انسانی تعلقات کے نظریے کی متعین کردہ حدود کے حل کے لیے جنم لیا جو بصورت دیگر ایک دوسرے کے مخالف اور متضاد تھے۔ یوں "میکس ویبر" نے اس عقلیت پسندی تھیوری کا اظہار ایک موثر نقطہ نظر کے ذریعے کیا جو صنعتوں اور دیگر انسانی تنظیموں کی مختلف صورتوں پر لاگو ہوتا ہے۔

فیرل ہیڈی (Ferrel Heady) نے میکس ویبر کے نظریے کی توثیق میں افسر شاہی کو دو پہلوؤں (ساختیاتی اور طرز عمل) میں پیش کیا ہے۔ جس کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ساخت کا پہلو:(Structural Aspect)

i. اقتدار کی منضبط درجہ بندی
ii. ملازمین کی فعال مہارت کی بنیاد پر تقسیم کاری
iii. عہدیداران کے حقوق و فرائض کے تحفظ کے قواعد و ضوابط کا نظام
iv. مخصوص حالات سے نبرد آزما ہونے کے طریق کار کا نظام
v. تکنیکی قابلیت کی بنیاد پر ملازمین کے انتخاب اور ترقی کا نظام
vi. بلا شخصیت باہمی تعلقات کا نظام

۲۔طرز عمل کا پہلو:(Behavioral Aspect)

i. معروضیت
ii. مستقل مزاجی
iii. باشعور منتظمیت (شعور: وہ ذہنی عمل جس کے ذریعے انسان اپنی داخلی کیفیات یا خارجی صورت حال کا واضح وقوف اور ان سے مکمل طور پر آگہی حاصل کرتا ہے)
iv. بلا شخصیت باہمی تعلقات
v. منضبط رویہ، عمدگی

کرن خورشید اس نقطہ نظر کو یوں بیان کرتی ہیں:

> "Ferrel Heady while endorsing weber's view on the subject categorized the structural and behavioral aspects of bureaucracy."(4)

افسر شاہی کا یہ کلاسیکل نظریہ مثالی حیثیت رکھتا ہے تاہم دنیا بھر میں افسر شاہی کا طرز عمل ان تمام پہلوؤں سے منحرف دکھائی دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے وبیر کے نظریہ افسر شاہی کو سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ خورشید صدیقی لکھتے ہیں:

"میکس وبیر کا پیش کردہ نوکر شاہی کا یہ نظریہ ابتدا میں کافی پسند کیا گیا مگر جوں

جوں اس روایتی دفتر شاہی کے نقائص سامنے آتے گئے کاروباری حلقوں میں یہ طریقہ تنظیم متروک ہوتا چلا گیا۔"(۵)

نتیجتاً افسر شاہی کی قباحتوں کے ضمن میں مائیکل کروزیئر (Michel Crozier) کا نظریہ منظر عام پر آیا۔ مائیکل کروزیئر اپنی کتاب "The Bureaucratic Phenomenon" میں یوں رقمطراز ہیں:

".....the slowness,the pondrouses,the routine,the complication of procedures and the mal-adoptedreposes of the bureaucratic organization to the needs which they should satisfy."(6)

افسر شاہی مجموعی طور پر سر تا پا دو نظاموں کا احاطہ کرتی ہے۔ اولاً سول بیوروکریسی ثانیاً فوجی بیوروکریسی۔ سول سروس افسر شاہی کا ایک پہلو ہے جو کہ تمام تر سول معاملات کی جانچ پرکھ کا نام ہے۔ تاہم مخصوص حالات میں سول اور فوجی بیوروکریسی دونوں انتظامی امور کی تکمیل اور مشکلات سے نبرد آزما ہونے کے لیے باہم مربوط ہو جاتی ہیں۔ سول سروس افسر شاہی نظام کے اعلیٰ عہدوں پر مشمول ہے جو کہ متعدد انتظامی امور کی انجام دہی کے لیے میرٹ کی بنیاد پر ایک مقابلہ جاتی امتحان کے ذریعے منتخب کیے جاتے ہیں عموماً افسر شاہی ایک پیچیدہ اور غیر لچکدار ساختیاتی تنظیم کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ افسر شاہی ایک انتظامی ڈھانچہ اور قواعد و ضوابط کی شکل یا حکومتی نظام ہے۔ انتظامی ڈھانچے میں تکنیکی عوامل کارفرما ہوتے ہیں جبکہ حکومتی نظام یا قواعد و ضوابط میں سیاسی پہلو کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اگر افسر شاہی کے مفہوم کے بعد اس کی ارتقائی صورت کی جانب سفر طے کریں تو پہلے لفظ ارتقاء کی تفہیم از حد ضروری ہے۔ ارتقاء ایسی تبدیلی کا نام ہے جو کسی چیز یا متن میں ایک ریاست سے دوسری ریاست میں ہوتی ہے۔ "مشتاق احمد وجدی" اس حوالے سے اپنا خیال یوں پیش کرتے ہیں: "یونان میں ہرقلیطاس ایک بڑا حکیم گزرا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عالم میں کسی چیز کو استقلال نہیں۔ یہاں کی ہر چیز تغیر پذیر ہے۔"(۷)

بسااوقات لفظ ارتقاء ترقی کے مترادف کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔اسنسپر نے بھی آغاز میں لفظ ترقی ہی استعمال کیا تھا۔ بعدازاں اسے بدل کر ارتقاء لکھنے لگا۔ یہ تبدیلی بلاوجہ نہیں تھی۔اولاً تو ترقی اور تنزلی کے معیار کا تعین ہمارے لیے ناممکن ہے۔ثانیاً اگر ہم ان الفاظ کے کچھ معنی فرض بھی کر لیں تو اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ جن تبدیلیوں کا تعلق ارتقاء سے ہے وہ کبھی ترقی متصور ہوں گی تو کبھی تنزل۔ یہ ارتقائی صورت بتدریج تاریخ کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور تاریخ (History) کی اہمیت سے قطعاً انکار ممکن نہیں ہے۔تاریخ ایک ایسے تسلسل کا نام ہے جو زمان و مکان کے مابین ابعاد کے ربط میں بغیر کسی توقف کے پیدا ہوتا ہے اور یہ تاریخ ثقافتی، سماجی، سیاسی، اقتصادی عناصر اور عصری تصورات میں بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ماضی اور حال کی کوکھ میں کلبلانے والے زمانے سے عبارت تاریخ کا یہ مسلسل عمل جب اپنے عناصر ترکیبی کے توسط سے جنم لے کر ماضی میں ڈھلتا رہتا ہے تو دوہرے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ایک طرف تو یہ ان عناصر سے تشکیل پاتا ہے تو دوسری طرف ان تشکیلی عناصر کو پروان چڑھانے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔افسر شاہی کے حوالے سے بھی تاریخ کے یہی اصول کارفرما ہیں۔افسر شاہی کی تاریخ بہت طویل ہے۔اس کا آغاز زمانہ قبل از تاریخ سے ہوتا ہے۔یونانی فلسفی افلاطون (Plato) نے اپنی مایہ ناز تصنیف ''The Republic'' میں انتظامی امور کے آغاز وارتقاء کی بابت تفصیلاً بیان کیا ہے کہ کس طرح پیشہ ورانہ تربیت یافتہ انتظامیہ کی توسیع ہوئی۔ کرن خورشید لکھتی ہیں:

> ''The Greek philosopher Plato's masterpiece Republic has given the posterity a detailed account as to how a professionally trained administration be evolved.''(8)

غالباً وہ پہلا فلسفی تھا جس نے اس حقیقت کی اہمیت کو تسلیم کیا کہ کسی فرد کی شخصی خصوصیات، لیاقت خداداد، میلان کی انتظامی امور کی انجام دہی کے لیے مناسبت کا تعین کرتے ہیں۔اگرچہ افلاطون کی یہ تجاویز غیر لچکدار نوعیت کی حامل تھیں اور منتظمیت کی چند سطحوں میں بنیادی انخلاء کے بعد اس نے سماجی طبقات یا دفاتر میں امور کی انجام دہی کی روانی میں رکاوٹیں حائل کر دیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کے مجوزہ تعلیمی اور تربیتی نظام نے تمام افراد (مرد اور خواتین) بغیر کسی مقتدر ترجیح اور طرف داری کے یکساں مواقع فراہم کیے۔ تمام انتخابی

عمل کی نگرانی اور تعلیم کی فراہمی ریاست کی ذمہ داری تھی۔افلاطون کو یہ یقین تھا کہ مجوزہ نظام اقربا پروری اور امارت کے عناصر کے اخراج کے بعد افراد میں عوام کی خدمت اور حوصلگی کا جذبہ پیدا کرے گا۔متذکرہ بالا نظریہ دونوں فوجی اور سول بیوروکریسی میں انتخابی عمل کے استعمال کیا گیا لیکن یہ نظریہ مکمل طور پر نافذ نہ ہو سکا۔

سول سرونٹ کی عملی مثال کے شواہد سب سے پہلے ''سومیری تہذیب'' (Sumerian civilization) میں ملتے ہیں جب انسانی تاریخ میں پہلی بار لکھنے کا نظام متعارف کروایا گیا۔لیکن ''سومیری متن'' اتنا پیچیدہ تھا کہ وہی افراد مفید ثابت ہوئے جو باقاعدہ اس مقصد کے لئے تربیت یافتہ تھے۔یہ ماہرین ''کاتب''(Scribes) کہلاتے تھے۔ان کاتبین کے پاس منتظمیت کے تمام تر اختیارات موجود تھے یہاں تک کہ تمام ریکارڈز کے اپنے پاس محفوظ کرنے اور بادشاہت کی یادگاروں پر نوشتہ جات کی تخلیق پر مکمل اجارہ داری حاصل تھی۔اس تاریخ کے بعد میں آنے والے عہد میں افسر شاہی قدیم ایران میں ''ہخامنشی سلطنت''(Achaemenid Empire) کے زیر سایہ پروان چڑھی۔جہاں پر بادشاہت کو صوبوں میں منقسم کیا گیا اور ان صوبوں کی سربراہی صوبیدار (حالیہ گورنر) کے پاس تھی۔یہ افسران صوبوں کے تحفظ کے لیے بادشاہ کی طرف سے منتخب کردہ تھے۔مزید یہ کہ ہر صوبے میں بالترتیب فوجوں کی بھرتی، رہنمائی اور ریکارڈز کو محفوظ کرنے کے لئے ہر صوبے میں ایک جنرل اور ایک شاہی سیکریٹری بھی تعینات تھے علاوہ ازیں بادشاہ کی طرف سے مقامی حالات کی مخبری اور مملکت کے دورے کے لیے ایک شاہی انسپیکٹر کو بھیجا جاتا تھا۔

اچاریہ چانکیہ کی تصنیف ''ارتھ شاستر'' کے قدیم متن میں بھی انڈیا کی قبل از تاریخ میں ایک وسیع انتظامی ڈھانچے کی موجودگی کے آثار ملتے ہیں۔اگرچہ صحیح عہد کی نشاندہی موجود نہیں تاہم مصنف نے موریہ سلطنت(Moriya Empire) کو چلانے کے لیے ایک موثر انتظامی ڈھانچے کی ضرورت کو بیان کیا ہے۔شان الحق حقی متذکرہ بالا تصنیف کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''یہ کتاب دراصل بادشاہوں کا دستورالعمل ہے۔دوسرے سیاسی، انتظامی، ،سماجی اور اخلاقی موضوعات و مطالب کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی جتایا ہے کہ بادشاہ کی طرف سے اجراء ہونے والے فرامین، مراسلات وغیرہ کس طرح لکھے جائیں۔تحریریں کس کس نوعیت کی ہوتی ہیں اور ان کے لیے کیا پیرائے اختیار کرنے چاہییں۔انشاء کے عیوب و محاسن کیا ہیں، وعلیٰ ہذالقیاس،''(۹)

مصنف نے انتظامی امور سے متعلقہ افسران کی بھرتی، نگرانی اور کارکردگی کی جانچ پرکھ کے ساتھ ساتھ منضبط انتظامی ڈھانچے کے لیے سفارشات بھی مرتب کی ہیں۔ قدیم عہد میں پبلک سروس کے لیے افسران کی بھرتی کا عمل وراثت اور سرپرستی کے ذریعے بروئے کار لایا جاتا تھا۔ اہمیت حاصل کرنے کے لئے رفقاء اور خاندانی اثر ورسوخ آلہ کار کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ان طرائق سے حاصل ہونے والی ملازمتوں کی اکثر و بیشتر خرید وفروخت ہوتی تھی۔ عہد حاضر کی افسر شاہی کے آغاز کے آثار کو قرون وسطیٰ کی سلطنت میں تلاش کیا جا سکتا ہے جہاں ''چن خاندان''(Qin Dynasty)(۲۰۷۔۲۲۱ قبل مسیح) کے زیر سایہ بھرتی کے لیے میرٹ کا ایک باقاعدہ نظام متعارف کروایا گیا۔ کنفیوشس(Confucius)(5BC) جو کہ چین کا ایک عظیم عالم تھا، چین کی افسر شاہی کی تنظیم و ترتیب میں ایک آلہ کار کے طور پر جانا جاتا تھا۔ امیدوار کے لیے مضمون میں اس کے تحریر کردہ متن کو روانی کے ساتھ پڑھنا لازمی قرار دیا گیا تھا۔ ہان خاندان (202B.C or220AD) کے دور حکومت میں ایک ''Xialian system'' متعارف کروایا گیا۔ جس میں سرکاری دفاتر میں تقرری کے عمل کے لیے قابل افراد کی سفارشات از حد ضروری تھیں۔ سول اور فوجی بیوروکریسی دونوں کے لیے میرٹ کی بنیاد پر تقرریاں کی جاتی تھیں۔ قابلیت کی بنیاد پر تقرری کا یہ قانون ''ہان خاندان''(Han Dynasty) کے بعد زیادہ موثر نہ رہا اور نتیجتاً ایک نئے ''Nine-Rank system'' نے اس کی جگہ لے لی۔

سوئی خاندان(۵۸۱۔۶۱۸) کے عہد حکومت میں میرٹ پر مبنی نظام کی بحالی کے لئے ایک کوشش کی جس میں سول سروس میں تقرری کے لیے تحریری امتحان کو لازمی قرار دیا گیا۔ بعد ازاں تھانگ خاندان(Tang Dynasty) کے دور اقتدار جو کہ ۹۰۷ سے ۶۱۸ تک کے دورانیے پر محیط ہے, میں اس کو بحال رکھا گیا۔ ''سانگ خاندان''(Song Dynasty) کے دور حکومت(۹۶۰۔۱۲۷۹) میں افسر شاہی (Bureaucracy) کو اس حد تک مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی کہ وہ اپنی تنخواہوں کی وصولی مرکزی حکومت سے کرتی تھی۔ اس عہد میں سرکاری مراسلات صرف بیوروکریٹس ہی پڑھ اور لکھ سکتے تھے۔ ان خصوصیات کی بنا پر وہ سرکاری علماء(The Scholar Officials) کہلاتے تھے۔ سول سرونٹ کو قابل اور مکمل بیوروکریٹ بننے کے لیے کئی امتحانات میں کامیاب ہونا لازم تھا۔ سرکاری علماء کا یہ طبقہ امیر تاجروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ میرٹ کی بڑھتی ہوئی ترجیحات کا مطلب طبقہ اشرافیہ کی سفارشات پر

مبنی چند تقرریاں تھیں۔اس لئے چین کو نہ صرف میرٹ کی بنیاد پر مقابلہ جاتی امتحانات کے انعقاد کا اعزاز حاصل کرنے پر فخر تھا بلکہ سرکاری امور کی انجام دہی کے لیے طرز عمل کو بھی پہلی بار چین میں متعارف کروایا گیا۔

اسلامی تاریخ کے اموی، عباسی اور عثمانی ادوار:۔

عباسی اور عثمانی دورِ حکومت میں سلطنت کا نظم و نسق چلانے کے لیے سرکاری محکموں کے لیے چار وزراء کو ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ سلطنت دہلی میں بھی نظریاتی نقطہ نظر سے یہی اصول کار فرما دکھائی دیتا ہے۔ اس اصول پر ہمیشہ عمل درآمد نہیں ہو سکا تاہم مغلیہ دور میں اس نظریے اور اصول کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مغلیہ خاندان کے بادشاہ اکبر کے دورِ حکومت میں چار وزیر سلطنت کا نظم و نسق چلانے پر مامور کیے گئے۔ ابنِ حسن اپنی کتاب بعنوان "سلطنتِ مغلیہ کا مرکزی نظامِ حکومت" میں اس خیال کی تائید کچھ اس طرح کرتے ہیں: "اکبر اور اس کے مشیروں نے یہ چار وزیر رکھنے کا فیصلہ کیا۔(1) دیوان (2) میر بخشی (3) میر سامان (4) صدر"۔[۱۰]

عباسیوں اور عثمانیوں کے دورِ اقتدار میں ایک وزیر بقیہ تمام وزیروں پر حاوی رہتا تھا۔ ابنِ خلدون بھی اس کو درست خیال کرتا تھا اس طرح سرکاری محکمہ جات کا انتظام تو چار وزراء کے ذمے رہتا تاہم مجالس مشاورت میں دوسرے لوگوں کو بھی شامل کیا جاتا تھا۔ دیوان کو وزراء کے مقابلے میں کچھ زیادہ اختیارات ضرور حاصل تھے لیکن وہ ان پر حاوی نہیں تھا۔ چونکہ منصب وکالت کے فرائض و اختیارات سلب ہو چکے تھے اس لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ تمام فرائض کی تقسیم کاری کا عمل متعدد وزراء کے مابین اس طرح بروئے کار لایا جائے کہ ایک طرف تو وہ انتظامِ سلطنت چلا سکیں دوسری طرف وہ اپنے اختیارات کو بے جا استعمال نہ کر سکیں۔

ایسا اس صورت میں ممکن تھا کہ سلطنت کے تمام کام ان میں تقسیم کر دیے جائیں۔ ہر وزیر اپنے اختیارات کی حدود میں خود مختار رہتے ہوئے بادشاہ کے سامنے جواب دہ ہو۔ وان کریمر (Von Kremer) کے مطابق خاندانِ عباسیہ نے ایک حکمران کی نظر میں ایک معزز قاضی، ایک منصف کوتوال، ایک کاروباری صلاحیت رکھنے والا وزیر خزانہ اور ایک معتبر صاحبِ برید حکومت کے نہایت اہم آلہ کار تھے۔ وان کریمر کے مطابق اس دور میں ترک اور مسلمان دونوں چار کے عدد کو مقدس و مبارک سمجھتے تھے۔ عثمانی مصنفین نے اپنی حکومت کو ایک ایسے خیمے سے تشبیہ دی جس کی بنیاد چار ستونوں پر قائم ہے۔ وہ ستون یہ ہیں۔(الف) وزراء، (ب) قاضی عسکر، (ج) دفتر دار، (د) نشانچی۔ اس ضمن میں اگر اسلامی تاریخ کی بغور ورق گردانی کی

جائے تو ابنِ خلدون کی سلطنت میں ان چار ستونوں کا ذکر ملتا ہے۔ ابنِ حسن ابنِ خلدون کے عہدِ حکومت میں سلطنت کے نظم و نسق سے متعلق لکھتے ہیں:

"ابنِ خلدون بھی مرکزی حکومت کے چار اعلیٰ حکام کا ذکر ملتا ہے (الف) وزیر کو صدر کی حیثیت سے درباری فرائض کے ساتھ فوجی اختیارات بھی حاصل تھے (ب) دیوانِ اعمال و خراج (وزیر مال)۔ (ج) حاجب اس کے ذمہ دربار کا انتظام ہوتا تھا (د) دیوانِ رسائل و مکاتیب"(۱۱)

سلطنت دہلی میں سرکاری محکموں کا ذکر پہلی بار ہمیں اس نصیحت سے ملتا ہے جو بغرا خان نے اپنے فرزند کیقباد کو کی تھی۔ اس نے بھی چار ارکانِ سلطنت رکھنے کی نصیحت کی ہے۔ ایک دیوانِ وزارت کا ذمہ دار، دوسرا دیوانِ رسالت کا سربراہ، تیسرے کو دیوانِ عرض اور چوتھے کو دیونِ انشاء کے فرائض انجام دینے چاہئیں۔ لیکن جہاں تک ان محکموں کی عملی تنظیم کا تعلق ہے تو ان میں سے (اوّل، دوم) سلطنتِ دہلی میں ہمیشہ باقی رہے اور محکمہ عدل قاضی ممالک (چیف جسٹس یا صدر)، مفتی، محتسب و میر دار پر مشتمل تھا۔ چوتھے محکمے کے بارے میں کوئی باقاعدہ ثبوت نہیں ملتا اگرچہ دبیر (چیف سیکریٹری) تقریباً وہی فرائض انجام دیتا تھا اور علاؤالدین کے زمانے میں اس منصب کو بہت اہمیت حاصل تھی۔

مغل افسر شاہی نظام:۔

مغلیہ سلطنت 1526ء سے 1857ء تک برِ صغیر پاک و ہند پر حکومت کرنے والی ایک مسلم سلطنت تھی جس کا بانی ظہیر الدین بابر کو مانا جاتا ہے جو تیمور خاندان کا ایک سردار تھا۔ بابر کے عہد میں سرکاری عہدیداروں کے لیے منصب دار کی جگہ وجہ دار لفظ مستعمل تھا لیکن بعد میں مغلیہ دورِ حکومت میں جب منصب نظام کا ارتقاء ہوا تو بابر کے وجہ داری نظام سے قطعاً مشابہت نہیں رکھتا۔ اکبر نے منصب داری نظام واضع کیا۔ وہ سابقہ نظام سے کئی نہایت اہم پہلوؤں سے مختلف تھا۔ ابنِ حسن اس خیال کی تائید میں یوں رقمطراز ہیں:

"اکبر اور اس کے مشیر کاران بھی مسلم فقہا اور مسلم ممالک کے منتظموں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ بھی اس طریقہ کار کے پابند رہے جو سلطنت دہلی میں رائج تھا۔ اس طرح ان وزراء کی تعداد چار ہی رہی، جو فرائض سلطنت کی انجام دہی کے سلسلے میں ذمہ دار

تھے۔ان وزراء میں دیوان شامل نہیں ہے کیونکہ وہ نظم و نسق کا مستقل اور لازمی رکن نہیں تھا"(۱۲)

دیوان یا دیوانِ کل (دیوانِ اعلا) مالگزاری اور مالیات کا ذمہ دار تھا۔ میر بخشی یا بخشی اعلا فوجی محکمہ کا سربراہ تھا۔اس کی حیثیت دیوانِ عرض سے مشابہ تھی۔ میر ساماں حکومت کے کارخانوں اور مال خانوں کی دیکھ بھال کرنے والا سب سے بڑا عہدیدار تھا۔ صدر محکمہ امورِ مذہبی اور محکمہ عدلیہ کا سربراہ ہوا کرتا تھا۔

عباسی خاندان کے حکمران کے مشہور اقوال میں وزیر کا کوئی ذکر نہیں ملتا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسی خاندان کے آخری دور میں یہ مغل وزرائے اعظم کے لیے مخصوص ہو گیا تھا۔ لہٰذا ان وزراء میں سے کسی ایک کو وزیرِ اعظم کے عہدہ پر فائز کر دینے کے اور کسی اور وزیر کے اختیارات کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ حکومت کے دوسرے چار ارکانِ سلطنت کی حیثیت معمولی افسروں کی سی ہو جاتی تھی۔ جن کے ذمہ انتظامِ سلطنت سے متعلق روزمرہ کے معمولی کام ہوتے تھے۔ شبری، فوجی، عدالتی اختیارات اور بادشاہ کو مشورہ دینے کا حق صرف وزیر کو حاصل تھا۔ وزیر کی مذکورہ حیثیت بعد ازاں اکبر نے تسلیم کی۔ وہ بھی سلطنت کے چار ستونوں میں سے ایک ستون سمجھتا تھا۔اس کے ذمہ ایک مستقل محکمہ کا انتظام تھا۔ وہ حیثیت اور رتبے میں اپنے رفقائے کار سے ذرا بلند تھا لیکن اسے اس پر کوئی بالادستی حاصل نہیں تھی۔ دوسرے وزراء کے محکمے انکے زیرِ نگرانی نہیں تھے۔ ان وزراء پر اس کا کوئی قانونی دباؤ اور اثر نہیں تھا۔ وہ اپنے مخصوص دائرہ کار میں اس کی دخل انداز سے آزاد تھے۔ اکبر نے اس سلسلے میں ایک قدم اور آگے بڑھایا اور نہ صرف مشوروں ہی کی حد تک بلکہ نظم و نسق کے روزمرہ کے کاموں میں ان چاروں وزراء میں اتنی خوش اسلوبی سے ہم آہنگی پیدا کی کہ حکمت عملی اور ایک محکمے کے اہم معاملات کے سلسلے میں ایک دوسرے سے رابطہ قائم رکھنا ضروری ہو گیا۔ اکبر تدبیر سلطنت سے متعلق صرف انہیں چار وزراء کے مشورے نہیں سنتا تھا بلکہ تمام عمائدِ سلطنت اور امراء کے دربار میں کچھ وقت کے لیے حاضر رہنے کے دستور سے اس کا مشاورتی دائرہ کار کافی وسیع ہو گیا اور اسے ان کے تجربے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع مل جاتا تھا۔

برطانوی عہد میں افسر شاہی نظام:۔

عہد حاضر میں سول سروس کی جدید اصطلاح برصغیر پاک و ہند میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر سایہ اٹھارہویں صدی میں ظاہر ہوئی۔ جس کا بنیادی مقصد اپنے مفاد کے حصول کے لیے ایک قابل انتظامی

ڈھانچے کی تشکیل تھا۔ایک غور طلب اور دلچسپ بات یہ ہے کہ انڈیا میں مقابلہ جاتی امتحانات کا آغاز ۱۸۵۴ء میں ہوا جبکہ انگلستان میں میرٹ کی بنیاد پر تقرری کا آغاز ۱۸۵۵ء میں ہوااور ایک سال بعد انڈیا میں اس کو نافذ کیا گیا۔ ۱۸۶۴ء میں پہلی مرتبہ چار ہندستانیوں نے سول سروس میں شمولیت کے لیے منعقدہ امتحان میں کامیابی حاصل کی۔تاہم ۱۹۰۹ء میں منعقدہ امتحانات میں ۱۴۴ کامیاب امیدواروں میں سے ہندستانیوں کی تعداد صرف ساٹھ (۶۰) تھی۔اس زمانے میں سول سروس (ICS) امتحانات میں شمولیت اختیار کرنے کے لیے برطانیہ جانا پڑتا تھا۔ جس کی وجہ سے متعدد ذہین افراد سرمایے کے فقدان کی بدولت امتحان میں شرکت سے قاصر رہ جاتے۔اس صورت حال کے پیش نظر اس وقت کے سرکردہ رہنماؤں میں قائداعظم سر فہرست تھے کہ جنھوں نے حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ سول سروس کے امتحانات کا انعقاد سرزمین ہندستان پر بھی ہونا چاہیے تاکہ وسائل کی کمی اہلیت کی راہ میں حائل نہ ہو۔اس زمانے میں دور حاضر کی طرح سول سروسز اکیڈمیوں کا الگ سے کوئی وجود نہ تھا بلکہ انگلستان کی بڑی یونیورسٹیوں میں آئی۔سی۔ایس (ICS) افسران کی باقاعدہ تربیت کی جاتی تھی۔آکسفورڈ کے ہندستانی تربیتی ادارے میں جرائم کا قانون، ہندستانی معاشرے میں رہن سہن کا طریقہ، انتظامی قانون، آرپی سی، ہندستانی زبانوں اور بولیوں کی تربیت دی جاتی تھی اور جس صوبے میں تقرری کا عمل ہوتا اس صوبے کی زبانوں پر بالخصوص زور دیا جاتا تھا تاکہ وہاں باہمی رابطے کے لیے زبان سے ناآشنائی انتظامی امور میں رکاوٹ کا باعث نہ بن سکے۔

یورپ بالخصوص برطانیہ نے اسلامی تاریخ کے اصولوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے ہاں جدید جمہوری ریاست میں بیوروکریسی کے محکمے کے لیے افراد کے انتخاب کے لیے وہی اصول وضوابط بروئے کار لائے جو کبھی حضرت عمر فاروقؓ کی ریاست میں عوام کی خدمت کے حوالے سے رائج تھے۔یوں برطانیہ دنیا کی سپر پاور کی حیثیت سے مشرق ومغرب پر حکومت کرنے لگا۔اسی تسلسل میں برِصغیر پاک وہند پر دنیا میں ان کی سب سے بڑی کالونی وجود میں آئی۔ یہاں جب برطانوی تسلط قائم ہوا تو حکومتی معاملات چلانے کے لیے افسر شاہی کی جو کھیپ تیار کی گئی اس کی اس لحاظ سے ایک اضافی تربیت کی گئی کہ ان کے دماغ میں عوم کی خدمت کی بجائے افسری، برتری بلکہ ایک قسم کی حکمرانی کے نظریے کو بٹھایا گیا جس کے نتیجے کے طور پر وہ ہندوستانی عوام کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

۱۸۰۶ میں لندن کے ہیلے بَرے کالج(Hailey bury college) میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی خدمت کے لیے نوجوان طبقے کی ذہنی تربیت کی گئی۔ جہاں ان کی ذہن سازی اس طرح کی جاتی کہ ہندوستان کو غلام بنا کر ان کے کے تمام تر وسائل پر کیسے قبضہ کیا جائے۔ ۱۸۳۳ کے بعد کمپنی ڈائریکٹروں کی منظوری کے لیے مقابلہ جاتی امتحان متعارف کروادیا گیا۔ ۱۸۵۳ کے بعد صرف انگریز گورے امیدوار ہی ان امتحانات میں شریک ہوئے۔ یہ منتخب شدہ بیوروکریسی ہندوستان میں سیاسی طاقت کو استعمال کرتی تھی بعد ازاں ۱۸۶۰ میں ہندوستانی لوگوں کو بھی امتحان میں شرکت کی اجازت مل گئی۔ تاہم اس کے پسِ پردہ ہندوستان کو خود حکومت کرنے کے لیے تربیت نہیں دے رہے تھے بلکہ ہندوستانیوں کو توہین آمیز اور تحقیر آمیز نظروں سے دیکھتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے منتخب افسروں نے خود کو عوام سے قدرے فاصلے پر رکھا۔ بند کمروں میں قانون سازی اور فیصلے ہوتے تھے۔

برطانوی دورِ حکومت میں دفاتر کی کاغذی کاروائی بھی اتنی پیچیدہ نوعیت کی تھی کہ کوئی کلرک بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ تمام اعلیٰ عہدوں پر تعینات نوجوان برطانوی افسر مقامی زبان اور حالات سے ناواقف تھے۔ صرف اور صرف کمپنی کے مفاد کے لیے کام کرتے تھے۔ ان کا طرزِ بود و باش عام عوام سے ممتاز کر دیا گیا۔ ان کی تربیت ایک غلام قوم پر حکمرانی کے لیے ہوتی تھی کہ جن کا واحد مقصد وسائل کو لوٹنا تھا۔ دورِ حاضر میں بھی پاکستان کی سول سروس کے افسروں اور حکمرانوں کی رہائش گاہیں انہی انگریزوں کی باقیات ہیں۔ یہی افسر شاہانہ ذہن تقسیم کے بعد یعنی نوآبادیاتی عہد میں پاکستان کو ورثے میں ملا۔ اس مرعوبیت نے ماضی کی عظمت کا تصور ہی چھین لیا اور اس خطے کے نوجوانوں کو ذہنی اپاہج اور مغرب زدہ بنا دیا جو غلامی کو مزید گہرا کرتا چلا گیا۔ افسوس کہ انگریز یہاں سے چلا گیا لیکن غلامانہ اور مرعوبانہ ذہنیت رکھنے والی افسر شاہی سوچ چھوڑ گیا جو افسر در افسر منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔ آزادی کے بعد بھی بیوروکریسی کے اس تربیتی نظام کو تبدیل نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے آج ۷۵ سال بعد بھی وطنِ عزیز میں وہی غلامانہ اصول و قوانین اور برتری کا ذہن رکھنے والی بیوروکریسی موجود ہے۔ جو عوم کے بجائے بالادست طبقات کے مفادات کی محافظ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اختیارات کا بے جا استعمال کر کے عوام کی زندگی میں آسانیاں پیدا کرنے کے بجائے ان کے لیے پریشانیوں کا ساماں پیدا کر رہے ہیں بلکہ یہ مناسب ہو گا کہ انہیں نوآبادیاتی عہد کی باقیات سے تشبیہ دی جائے جب نوآبادیات ظلم و زیادتی کا نشانہ بناتے ہوئے بے رحمی، من جانی اور طاقت سے آبادی کو فتح کرتے تھے۔

برصغیر پر انگریز کے تسلط کے خلاف ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی لڑی گئی۔ برطانوی تسلط نے اس جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں پر ترقی کے حصول کا دائرہ تنگ کر دیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس تجزیاتی رائے کے حوالے سے اتفاق کا اظہار کرتے ہوئے اپنے خیالات یوں رقم کیے ہیں: ''مغربی سامراج نے دو برس تک ہمیں خود ہمارے وجود کی روح اور اصل سے بے خبر رکھا۔''(۱۳)

مسلمانوں کے مروجہ نظام تعلیم کے متبادل لارڈ میکالے کا نظام تعلیم متعارف کروایا گیا۔ حقیقت میں یہ میکاولیت (Macauayism) تھی۔ اس ضمن میں لطف الرحمٰن اپنے ایک مضمون ''مابعد نوآبادیاتی تہذیبی جارحیت'' میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''یہ اصطلاح تھامس بابنگٹن میکالے (Thomas Babington Macauly) (۱۸۵۹۔۱۸۰۰) سے منسوب ہے جو ۱۸۳۰ء میں کلکتہ میں گورنر جنرل کونسل کا ایک ممبر تھا۔ جس کی وکالت کے نتیجے میں ہندستان میں انگریزی نظام تعلیم رائج ہوا۔ جس کا واضح مقصد بھورا صاحب (Brown Sahib) پیدا کرنا تھا جو اپنے مزاج کے اعتبار سے انگریز ہو۔''(۱۴)

اس تعلیمی نظام کی بدولت اعلیٰ مناصب پر فائز ہونے کے لیے انگریزی تعلیم لازمی قرار دی گئی۔ جب تمام راستے مسدود ہونے لگے تو سر سید احمد خان نے ''مفاہمت'' اختیار کرنے کا نظریہ پیش کیا اور مسلمانوں کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ انگریزی تعلیم کے حصول کو یقینی بنائیں۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے سول سرونٹ کی اصطلاح کو سول اور فوجی سرونٹ کے مابین امتیاز قائم کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اس وقت سے سول سروس کے نظام نے مغرب اور براعظم یورپ میں اپنا وجود قائم کیا۔ مغربی نوآبادیاتی طاقتوں نے دنیا پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے لئے یہ نظام رائج کیا۔ اس ضمن میں کوئی ایک یکساں لائحہ عمل اختیار نہیں کیا گیا تاہم نو آبادیاتی سرپرستی اور غلبہ قائم رکھنے کی خواہشات کو برقرار رکھنے کے لیے چند تبدیلیاں کی گئیں۔ ایسی تمام ریاستیں جنھوں نے نوآبادکار کے تسلط سے آزادی حاصل کی انھیں افسر شاہی کا وہی انتظامی ڈھانچہ ورثے میں ملا۔ ماضی سے چھٹکارا نہ پا سکنے کی بدولت ایسی ریاستیں کوئی ساختیاتی یا طرز عمل کی تبدیلی نہ لا سکیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مابعد نوآبادیاتی عہد میں بھی افسر شاہی نوآبادیاتی میراث کا عکس دکھائی دیتی ہے۔ دور حاضر میں ترقی یافتہ ممالک میں افسر شاہی نظام ترقی پذیر ممالک کی نسبت زیادہ فعال اور خدمت پرست دکھائی دیتا

ہے۔آج کل متعدد ترقی یافتہ ممالک نوآبادکاروں کے زیر تسلط رہ چکے ہیں لہذا رسمی آزادی کے حصول کے بعد بھی مملکت کا انتظامی ڈھانچہ وہی ہے۔

ii. افسر شاہی کی خوبیاں:

دنیا کے نقشے پر موجود ترقی یافتہ ممالک کا اگر بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو ان ممالک کا تمام شعبہ ہائے زندگی میں عروج سول سوسائٹی کے عروج سے مشروط نظر آتا ہے اور سول سوسائٹی کی ترقی و عروج کے ضامن سول ادارے قرار پاتے ہیں۔یہ ادارے ملکی آئین کے تابع ریاست ترقی و خوشحالی کے لیے شب و روز سرگرداں رہتے ہیں۔ملکی حکومتوں میں تغیر و تبدل آتا رہتا ہے۔تاہم سول اداروں کا کردار جسم میں ریڑھ کی ہڈی کی مانند مضبوطی سے قائم و دائم رہتا ہے۔

بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے بھی سول سروس کو ملک کی ریڑھ کی ہڈی قرار دیا تھا۔اس حوالے سے بابائے قوم قائد اعظم محمد علی جناح کا سول آفیسرز کے نام فرمان ملاحظہ کیجیے:

> ''اگر آپ پاکستان کے وقار اور عظمت کو بڑھانا چاہتے ہیں تو آپ کو ہرگز کسی دباؤ میں نہیں آنا چاہیے۔آپ کو ملک اور عوام کے خادم کے طور پر کام کرنا چاہیے۔اس سلسلے میں بے خوف ہو کر دیانتداری سے کام لیں۔سول سروس ملک کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہے۔دستور کے مطابق جو بھی حکومت قائم ہو جو کوئی بھی وزیر اعظم یا وزیر برسر اقتدار ہو،آپ کا فرض نہ صرف وفاداری اور ایمانداری سے حکومت کی خدمت کرنا ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ بے خوف ہو کر کام کرنا ہے۔آپ کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنے سروس کے اعلیٰ وقار،اس کی اعلیٰ شہرت،اس کے احترام اور اس کے دیانتدارانہ کردار کو قائم و دائم رکھیں۔''(۱۵)

برطانوی تسلط سے آزادی کے وقت برصغیر پاک و ہند میں سول سروس کا ادارہ نوزائیدہ مملکت پاکستان کے انتظام و انصرام کو چلانے کے لیے موجود تھا۔تاریخ انسانیت کا ایک اہم پہلو تشکیل پاکستان ہے جس میں فکری و نظریاتی بنیاد اس نظریے پر ہے کہ حاکمیت اعلیٰ خدائے وحدہ ہو لا شریک کی ہے اور اعلیٰ اقتدار کا مرجع و منبع اخلاق محمد ﷺ ہے۔ریاست مدینہ کے بعد دوسری بڑی نظریاتی مملکت ہونے کا شرف ''پاکستان'' کو حاصل

ہے کہ جہاں حاکم و عامل عوام کی فلاح و بہبود کے ضمن میں بنت سے لے کر عمل تک سراپا خدمت نظر آئے اور اس نظریاتی مملکت کے افراد نے دنیا کی دوسری قوموں کے لیے امامت کا فریضہ سرانجام دینا تھا۔

اس لیے پبلک سرونٹس یعنی عوام کے خدام کو بھی، صداقت، شجاعت جیسے بنیادی اوصاف حکمرانی سے اپنے کردار اور قول و فعل کو پرکشش اور قابل تقلید بنانا چاہیے۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے ۲۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو چٹاگانگ کے مقام پر افسرانِ حکومت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> ''میں چاہتا ہوں کہ آپ اس انقلابی تبدیلی کے گہرے اثرات و نتائج کا پورا پورا احساس کریں۔ آپ خواہ کسی بھی فرقے، ذات یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ بہر حال اب آپ پاکستان کے خادم ہیں۔ اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں سے صرف خدمت کر کے ہی عہدہ برا ہو سکتے ہیں۔ وہ دن گئے جب ہمارے ملک پر نوکر شاہی کا راج تھا۔ یہ عوام کی حکومت ہے اور عوام کے سامنے جوابدہ۔۔۔۔۔۔۔ کم و بیش جمہوری خطوط پر اور پارلیمانی روایات کے مطابق۔''(۱۶)

درج ذیل میں افسر شاہی سے متعلقہ افراد کی ان خوبیوں کا احاطہ کیا جاتا ہے جو عوام کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ناگزیر ہیں اور ان سے تجاوز کرنا بد عملی کے زمرے میں آئے گا:

ا۔ محب وطن:(Patriotic)

ایک سرکاری افسر کو محب وطن(Patriotc) ہونا چاہیے کہ جس کی بدولت پوری تندہی اور دلی وابستگی سے قوم کی خدمت کر سکتا ہے تاکہ انتظامیہ کی جانب سے عوام کو ان کی جائیداد، زندگی اور مذہبی اعتقادات کے تحفظ کو یقینی بنایا جا سکے۔ جیسا کہ سرکاری افسران یا انتظامیہ کا بنیادی مقصد حکومتی پالیسیوں کو مرتب اور ان پر عمل درآمد کے ضمن میں عوام کے مفاد کے ساتھ ساتھ ملکی مفادات کو ذاتی مفادات پر ترجیح دینا ہے کیونکہ ان ذمہ داریوں اور طاقت کی بدولت اٹھایا گیا ہر قدم گراں قدر ثابت ہوتا ہے۔ اس حوالے سے قائدِ اعظم نے افسران حکومت سے خطاب کرتے ہوئے ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو فرمایا:

> ''چونکہ حکومت کی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری سرکاری ملازمین پر عائد ہوتی ہے، اس لیے یہ دیکھنا ان کا فرض ہے کہ اس پر کماحقہ عمل ہو رہا ہے یا نہیں تاکہ ہم پر یہ الزام نہ آئے کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے۔ آپ لوگ ہی عوام کو

حکومت کی نیک نیتی کا یقین دلا سکتے ہیں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ سرکاری ملازمین ہمیں اس سلسلے میں مایوس نہ کریں گے۔"(۱۷)

۲۔ قانونی اور عقلی اقدامات:(Legal and Rational Actions)

بحیثیت سول سرونٹ(Civil Servant) سرکاری افسران کو سربراہ اور منتظم ہونے کے ناطے قوانین اور ضوابط کی پابندی کرنی چاہیے۔ ان کو کسی بھی صورتحال میں قوانین اور ضوابط کی پابندی کے ضمن میں عقلی اقدامات اٹھانے چاہییں۔

۳۔ فرائض اور ذمہ داریاں:(Resposibilities and Laibility)

سرکاری افسران کا اولین فرض اپنے دائرہ اختیار میں شامل علاقے کے روزمرہ کے انتظامی امور کی جانچ پرکھ ہے۔ ہنگامی صورتحال میں افسران کو حکومت کی جانب سے تفویض کردہ امور کی انجام دہی اور ذمہ داریوں کی بجاآوری کا بھرپور خیال رکھنا چاہیے۔ "ونسٹن چرچل" کے مطابق The price of greatness is responsibility'. اس نقطہ نظر کے ضمن میں قائداعظم اپنے خیال کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

"مجھے امید ہے کہ آپ میں سے ہر ایک اپنے اپنے دائرہ عمل اور اپنی اپنی ذمہ داری سے آگاہ ہوگا۔ مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ ایک دوسرے سے مکمل تعاون اور ہم آہنگی کے ساتھ کام کیجیے، ذہن میں یہ رکھتے ہوئے کہ اسے اپنے اپنے دائرہ عمل کی حدود میں رہنا ہے۔"(۱۸)

۴۔ محنت اور عظمت:(Hard work and Commitment)

سرکاری افسران کے دائرہ اختیار میں شامل علاقے مختلف شعبہ جات جیسے انتظامی امور، فنڈز کا انتظام، قوانین کا نفاذ اور ترقیاتی پروگراموں پر مشمول ہیں۔ جس کی بدولت ان پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اولاً کام کی انجام دہی میں بھرپور لگن کا مظاہرہ کریں ثانیاً ہر طرح کے حالات میں پرعزم رہیں۔ بقول قائداعظم محمد علی جناح:

"یاد رکھیے کہ آپ کی حکومت آپ کے ذاتی باغ کی مانند ہے۔ آپ کے باغ کے پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کا انحصار اس پر ہے کہ آپ اس کی نگہبانی کرتے ہیں اور اس کی

کیاریوں اور روشوں کو بنانے سنوارنے میں کس قدر محنت کرتے ہیں۔اسی طرح آپ کی حکومت بھی صرف آپ کی وطن پرستانہ، مخلصانہ اور تعمیری کوششوں کی بناپر ترقی کر سکتی ہے۔ حکومت میں اصلاح کاواحد طریقہ آپ کی بے لوث محنت ہے۔"[۱۹]

۵۔فیصلہ کن اور لچکدار رویہ بحوالہ نقطہ نظر:(Decisive and Resilient in Approach)

حکومتی مشینری کے ایک رکن ہونے کی حیثیت سے ان کا نقطہ نظر لچکدار ہونا چاہیے تاکہ نظام،امور،ساخت اور طرز عمل کے اصولوں میں ہونے والے انقلابات کے مطابق حکمت عملی وضع کی جا سکے۔دوران ملازمت انہیں مشکل اور صبر آزماحالات پیدا ہو سکتے ہیں کہ جن کو کم سے کم مدت میں سلجھانا ہوتا ہے۔ان حالات کو نمٹنے کے لیے کمال ہوشیاری سے کام لیناپڑتا ہے جس کے لیے فیصلہ کن حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے فوری تدبیر،دستیاب شدہ ممکنات کا تجزیاتی عمل اور ممکنہ حل کی ضرورت ہوتی ہے۔جس پر تمام تر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔

۶۔افادیت پسندی کااصول:(Principle of Utilitarianism)

افادیت پسندی ایک ایسااخلاقی نظریہ ہے جو کسی شخص کے فعل اور پالیسی کے نتائج پر مبنی غلط اور صحیح کی نشاندہی کرتا ہے۔مزید یہ کہ دوسروں کے مفاد کے ضمن میں کسی کے افعال اور پالیسی کو بھی زیر غور لاتا ہے۔لہذا بحیثیت ایک منتظم اعلیٰ کے سرکاری افسران کواس امر کی یقین دہانی کرنی چاہیے کہ ان کا فیصلہ اور طرز عمل مملکت اور وہاں کے اکثریتی لوگوں(Maximum People)کے مفاد میں ہے۔

۷۔رقیق القلب:(Compassionate)

بحیثیت سول سرونٹ ایک سرکاری افسر کو ہمدردانہ اخلاق کا مجسم ہوناچاہیے تاکہ اسے نامساعد حالات اور ہنگامی صورتحال کے پیش نظراسے ہمدردانہ جذبات رکھنے کے ساتھ ساتھ متاثرین کی مدد کرنے کی تحریک حاصل ہو کیونکہ اسے حالات کامشاہدہ یاجانچ پرکھ ہی نہیں کرناہوتابلکہ ضرورت مندوں کی امداد کے ضمن میں قوانین کانفاذ بھی اس کی ذمہ داری ہے۔سرکاری افسر کو متعین کردہ قوانین وضوابط کی خلاف ورزی کے بغیر ہمدردانہ اور مخلصانہ جذبات کااظہار کرناچاہیے۔مختصراً یہ کہ اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوئی بھی پہلوفرو گزاشت نہیں کرناچاہیے۔

۸۔اصول انصاف:(Principle of Justice)

اصول انصاف عوام کے ساتھ درست اور شفاف طرز سلوک روا رکھنے کے لیے نا گزیر ہے۔ لہذا ایک سرکاری افسر کو اصول انصاف کو مد نظر رکھتے ہوئے تمام پیش آمدہ حالات میں شفاف اور منصفانہ فیصلوں کا یقین کرنا چاہیے۔ مزید براں سماجی انصاف کے تقاضوں کو شفاف طریقے سے پورا کرنا چاہیے۔

۹۔شفافیت اور سالمیت:(Transparency and Integrity)

فیصلہ سازی کے عمل میں درست مشاہداتی عمل شفافیت کہلاتا ہے تاہم لفظ ''شفافیت''کسی بھی ملک کے انتظامی ڈھانچے میں انسدادِ بد عنوانی اور سرکاری امور کی انجام دہی کے ضمن میں مستعمل ہے۔ایک سرکاری عہدیدار کا طرز عمل شفافیت کا حامل ہونا چاہیے تاکہ اس کے امور کی انجام دہی کو پرکھنا سہل ہو سکے۔ سید عبد القدوس اس حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> "Love for truth and fair play has been the theme of every ethical system.In no other institution is there greater need for veracity than in administration,because decisions taken in this field have deep and for reaching repercussions."(20)

متذکرہ کتاب میں سید عبد القدوس قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "The Quran says; when you speak a word or pronounce a judgement,be true and just,though the person concerned be your relative,speak not falsely,although the declaration might be against your own interest or against your parents or your near relatives."(21)

تحقیق ہذا کا مقصد بنیادی طور پر افسر شاہی کے ہمہ جہت پہلوؤں کا احاطہ کرنا ہے۔ جس کے سبب جہاں قارئین کو افسر شاہی سے منسلک افراد کی پیشہ وارانہ اوصاف سے آشنائی حاصل ہو گی وہاں کچھ اہل علم کی تشنگی میں اضافہ ہو گا۔ اس مقدور بھر سعی کی بدولت اس درد میں اہل وطن کی شمولیت کے ساتھ ساتھ کوتاہ عمل افسران کو اپنے عمل پر نظر ثانی کے مواقع بھی ملیں گے۔ تحسین و تنقید پر مبنی اس تحقیق سے نئے افکار جنم لیں گے اور بہتری کے نئے راستے میسر آئیں گے۔

III. افسر شاہی کی قباحتیں:

ا۔ نظام میں قباحتیں:

افسر شاہی کے سماجی، سیاسی، تاریخی و ثقافتی صورتحال کے پس منظر میں نظر دوڑائیں تو طاقت اور علم کا گٹھ جوڑ اس کے محرک کے طور پر عیاں ہوتا ہے۔ جس سے نوآبادیاتی نظام کا نقشہ تیار ہوا۔ اس کے مفاد سیاسی نوعیت کے تھے لیکن اس کے نتائج کلونیل ازم کی شکل میں سامنے آئے اور متعدد قباحتوں پر منتج ہیں۔ افسر شاہی کے اس نظام نے نہ صرف اپنا تسلط قائم کیا بلکہ سماجی و ثقافتی افتراق و استحصال کی بنیاد رکھی۔ اس کے نمائندگان نے مخصوص حکمت عملیوں اور جاگیر دارانہ نظام سے طاقت اور اقتدار کا مادی اور سماجی استعمال کیا۔ محمد علی خالد اپنی کتاب بعنوان ''جی، ایچ، کیو سیاست کے صفحہ نمبر ۲۴۲ پر افسر شاہی کی قباحتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سرمایہ داروں اور جاگیر داروں کے گٹھ جوڑ کا اہم عنصر ملٹری اور سول بیوروکریسی رہی ہے۔ اس بیوروکریسی کی تربیت روایات کے تحت ہوئی ہے۔ سرمایہ دار اور جاگیر دار ملٹری اور سول بیوروکریسی کے تعاون کے بغیر ملکی اقتدار پر قابض نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ پارٹنر شپ ایک منظم منصوبے کے تحت کی گئی تاکہ پورے معاشرے پر اجارہ داری قائم کی جائے اور ملک میں سیاسی عمل فروغ نہ پائے۔ تقسیم کے بعد ضرورت اس امر کی تھی کہ نوآبادیاتی ڈھانچہ ختم کیا جاتا اور ملازمتوں کے پورے نظام کو تبدیل کیا جاتا۔ نئی مملکت کے تقاضے مختلف تھے لیکن ملٹری اور سول بیوروکریسی کے اطوار نہیں بدلے اور ملازمتوں کا ڈھانچہ جوں کا توں رہا۔''(۲۲)

اسی طرح رفیق شیخ نے ۱۹۹۳ء میں اپنی کتاب ''تاریخ پاکستان و ہند'' میں اس موقف کے استدلال کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

''امراء ایک طرح کی بیوروکریسی تھی۔ جن کو جاگیریں ملی ہوئیں تھیں وہ ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ باہمی چپقلش کی وجہ سے ریاست کی کمزوری کا بھی سبب بنتے تھے لیکن انھی کی قوت پر سلطانی دور کا حکمران انحصار کرنے پر مجبور تھا۔ (۲۳)

قائدِاعظم محمد علی جناح بھی سرمایہ داروں، نوابوں اور جاگیرداروں سے قطعی طور پر بیزار تھے۔ قائد کے ذہن میں ایک ایسی پاکستانی ریاست کا تصور موجود تھا کہ جس میں استحصالی طبقے اور رویے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ قائدِاعظم یقینی طور پر ایک فلاحی اور غیر استحصالی معاشرے کے قیام کے خواہاں تھے۔ مگر بدقسمتی سے ان کی رحلت کے بعد مسلم لیگ فوجی و سول بیوروکریسی کے قبضے میں چلی گئی۔ بعد ازاں صنعتی ارتکاز نے فوجی اور سول بیوروکریسی کو مستحکم کیا۔ آج پچھتر برس کے دورانیے میں سول اور ملٹری بیوروکریسی تمام سماجی نظام پر حاوی دکھائی دیتی ہے اور افسر شاہی کے نظام نے شخصی اقتدار کو استحکام بخشا۔ مشاہدے میں آتا ہے کہ شخصی آمریت کو مستحکم کرنے میں بیوروکریسی کے نظام کا اہم کردار ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ آمرانہ نظام میں احتسابی عمل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ جبکہ پاکستان کا افسر شاہی نظام احتساب سے ماوراء ہے۔

قیام پاکستان کے بعد کی افسر شاہی (Bureaucracy) کے طویل سفر میں بدقسمتی اور خوش قسمتی ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلتی نظر آتی ہیں۔ برطانوی تسلط کے تربیت یافتہ افسران اپنی تمام تر خامیوں اور خوبیوں سمیت نسل نو کے مربی بنے یعنی مابعد نوآبادیاتی عہد کا افسر شاہی نظام اس عہد کی ایک تصویر کے طور پر سامنے آیا اور عہد حاضر کے افسران کا ایک نیا طبقہ ظاہر ہوا۔ تاہم حکومتی ایوانوں میں سیاستدانوں نے قیام پاکستان کو قیام مالِ غنیمت تصور کیا اور افسر شاہی کے نظام کو بھی اسی غنیمت کا ایک حصہ جان کر اپنے پلڑوں کو بھاری کرنا شروع کر دیا۔ یوں افسر شاہی میں نظریاتی مملکت کی تربیت شامل نہ ہو سکی۔ گزشتہ کئی برسوں سے افسر شاہی کے اداروں اور ان کے نظام سے متعلق کئی سوالات اٹھائے گئے۔ عہد حاضر کے پاکستانی معاشرے میں سرکاری دفاتر اور افسر شاہی نظام کی سست روی اور سخت گیری کی صدائیں بلند ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس میں ذہین افراد کی کارکردگی کو ایک مخصوص نظام کے تابع کیا جاتا ہے۔ بہت سے افسران بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن ان کی صلاحیتیں اور خواہشات اس فرسودہ نظام کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔

۲۔ افراد کی بدعنوانی:

افسر شاہی کی قباحتیں ایک کثیر سمتی فکری تشکیل ہے۔ بسا اوقات یہ سیاسی و سماجی صورتحال کے مقتدر

تصورات و نظریات کی عکاسی کرتی دکھائی دیتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ متذکرہ بالا طبقات کی صورتحال نا مساعدتوں(Inadequacies)سے بھری پڑی ہے۔اس صورتحال نے ہر شعبہ ہائے زندگی میں تہلکہ مچا دیا تھا۔افسر شاہی کی قباحتیں مختلف مقامات پر مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں۔کہیں نظام کی قباحتوں کی صورت میں عیاں ہیں تو کہیں افراد کی بدعنوانی کی شکل میں جلوہ گر ہیں۔

مذکورہ بالا تحقیقی مقاصد پر رائے زنی سے قبل یہ امر ازحد ضروری ہے کہ بدعنوانی (Curruption)کی تعریف و توضیح کو احاطہ تحریر میں لایا جائے۔آکسفورڈ کیمبرج ڈکشنری کے مطابق بدعنوانی کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

"Corruption;(noun)

1.Disonest or fraudulent conduct by those in power,typically involving bribery.

2.The action or effect of making someone or something morally depraved."(24)

آکسفورڈ ڈکشنری بابت مروجہ انگلش کی روسے:

''بدعنوان بنانا''،''بدعنوانی کی حالت''،بدکاری''،اسی ڈکشنری میں لفظ بدعنوان اسم کے طور پر بھی مستعمل ہے۔''سڑا ہوا''،بدکار''،ضمیر فروش''اور بطور فعل اس لفظ کی توضیح یوں کی گئی ہے۔''بدعنوان بنانا''،بدکار بنانا''،رشوت دینا یا لینا''،''سڑنا''،منتشر ہونا۔

ویبسٹر نیو ورلڈ ڈکشنری کے مطابق:

(i)''بدعنوان بنانا (ii)بدکاری (iii)رشوت (iv)زوال پذیری یا سڑنے کی حالت (v)کوئی چیز جو بدعنوان ہو گئی ہو۔''(۲۵)

کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری کی روسے:

''(i)رشوت کے زیر اثر،(ii)خصوصا انتخابی عمل کے دوران،''[۲۶]

فیروز اللغات کی رو سے:

''(i)رشوت خور،(ii)ہیرا پھیری کرنے والا، (iii)بداطوار''[۲۷]

Marriam-Webster ڈکشنری میں ''بدعنوانی'' کی تعریف ان الفاظ میں تحریر کردہ ہے:

> "Dishonest or illegal behavior especially by powerfull people(such as government officials or police officers).Inducement to wrong by improper or unlawful means(such as bribery)."[28]

Merriam Webster میں تحریر کردہ دونوں تحاریف میں تعریف اولی کے مطابق بدعنوانی مقتدر طبقات خصوصا سرکاری عہدیداران اور پولیس افسران کی جانب سے بدیانت اور غیر قانونی طرز رویہ ہے جو عوام کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔اسی طرح تعریف ثانی کی رو سے غیر مناسب اور غیر قانونی زرائع کی وساطت سے جرم کی طرف ترغیب دینا جیسا کہ رشوت،بدعنوانی کے زمرے میں آتا ہے۔افسر شاہی کے ضمن میں بدعنوانی کی تعریف سے متعلقہ جن مباحث سے واسطہ پڑتا ہے وہ ''Pakistan Penal Code کے ہی مرہون منت ہیں۔اس کی وضاحت کے لیے Pakistan Penal Code (XLV of 1860) (6th October,1860) کے باب نہم بعنوان "Offences by or Relating to Public Servants'' میں درج ترتیب انتہائی اہمیت کی حامل ہے جو کہ درج ذیل ہے:

> "1.161-public servant taking gratification other than legal remuneration in respect to an official act.
>
> 2.162-taking gratification,in order by corrupt or illegal means to influence public servant.

3.163-taking gratification, for exercise of personal influence with public servant.

4.164-punishment for abetment by public servant of offences defined in section 162 or 163

5.165-public servant obtaining valuable thing,without consideration from person concerned in proceeding or business transacted by such public servant.

6. 165-A,punishment for abetment of offences defined in section 161 and 165.

7.165-B. certain abettors excepted.

8.166- public servant disobeying law, with intent to cause injury to any person.

9.167-public servant framing an incorrect document with intant to cause injury.

10.168- public servant unlawfully buying or bidding for property.

11. personating a public servant.

12. wearing garb or carring token used by public servant with fraudulent intent."[29]

در حقیقت بد عنوانی کی کوئی بھی وسیع تر اور جامع تعریف و توضیح ابہام سے مقابل ہوئے بنا سپرد قلم کرنا ناممکن ہے۔ایسے تمام اصول و ضوابط چاہے ان کی وابستگی سرکاری امور سے ہو یا انتخابی عمل سے ،اس بابت مجاز نہیں ٹھہراتے کہ بد عنوانی کی ایک تعریف کو مد نظر رکھ کر سرکاری عہدیداران کے اذہان کو اپنے بچاؤ کی راہ تلاش کر لینے کے مواقع مہیا کر دیے جائیں۔اس نسق زیست میں معاشرتی سطح پر بد عنوانی کے عروج میں ایک ایسے عمل کی کارفرمائی نظر آتی ہے جو تکنیکی اعتبار سے کسی ناگزیر ذرائع کی تائید و پیروی سے جنم لیتا ہے تاکہ ان اداروں کی جکڑ بندی میں مبتلا ذرائع کی تابعداری سے (جو فوری ثقافتی مقاصد کے حصول کے لیے مہیا ہوتے ہیں)عہد حاضر کے متعدد معاشروں میں بشمول پاکستان مقاصد میں کامیابی کے حصول کے لیے انحصار کیا جاتا ہے۔اس تمام سنگین صورتحال جو کہ سب کے لئے سوہان روح کی صورت اختیار کر چکی ہے،کے پیش نظر جدید ماہرین جرائم کے اذہان کو ایک سوال نے انتشار و ابہام میں جکڑ رکھا ہے کہ جرم میں کمی لانا اولین ترجیح ہے یا 'Criminality' کو؟۔اس سوال کے جواب کی کھوج میں مختلف ماہرین نے اپنی ذہنی استطاعت کے مطابق مختلف نوعیت کے نتائج اخذ کیے۔ان نتائج کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایک نقطہ تو یہ بھی منظر عام پر آیا ہے کہ جرائم میں کمی لانے کی سعی اور تگ و دو کا منطقی نتیجہ بد عنوانی (Corruption) میں اضافہ کی صورت دھار لے گا اور اس کا استدلالی نقطہ نظر کچھ یوں ہے کہ ایک برائی کے چکر کے جنم لینے کا اضمحال ہے جس میں سرکاری ملازمین اور زیادہ اختیارات حاصل کر لیں گے جبکہ عام شہری ان سرکاری ملازمین پر اپنے تحفظ اور مسائل کے ممکنہ اور فوری حل کے لئے زیادہ سے زیادہ انحصار کرنا سیکھ جائیں گے۔ نتیجتاً شہریوں کا اپنی ذات اور ایک دوسرے پر انحصار کا فقدان پیدا ہو جائے گا اور اپنے دفاع میں ایک دوسرے کے استحصال کی شروعات میں اضافہ ہو گا۔اسی طرح جرم کی دنیا میں اضافے کا رجحان پیدا ہوتا ہے اور سرکاری عہدیداران زیادہ اختیارات حاصل کرتے ہیں تاکہ وہ عام شہری کے دوسرے عام شہری سے تحفظ کے ضامن بن سکیں۔

متذکرہ بالا سطور سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جرائم اور بد عنوانی لازم و ملزوم ہیں اور ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر بد عنوانی سرکاری ملازمتوں کے اختیارات میں اضافے کا دوسرا نام ہے۔ان اختیارات کے حصول کے پس پردہ مقاصد یہ ہوتے ہیں کہ خود اعتمادی کے فقدان میں مبتلا شہریوں کے لیے نجات دہندگان کا کردار ادا کر سکیں۔شاید اسی ذہنی مشق سے یہ مراد بھی لی جا سکتی ہے

کہ ان معاشروں میں جہاں افسر شاہی کے اختیارات میں اضافہ ہوتا ہے وہاں نہ صرف جرائم اور بد عنوانی لازم و ملزوم ٹھہر جاتے ہیں بلکہ ایک ساتھ پروان چڑھتے ہیں یعنی ایک دوسرے کے لیے مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

بد عنوانی گزشتہ عہد کے آئینے میں:(Corruption in the prism of past)

سرکاری ملازمتوں (بیوروکریسی) میں بد عنوانی کا رجحان صرف عہد حاضر کی دین نہیں بلکہ قدیم یونان اور روما کی سرکاری ملازمتوں میں بد عنوانی کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔ یہاں تک کہ خلافتِ راشدہ کے نصف ثانی میں بد عنوانی اتنی ہی قدیم نوعیت کی ہے جتنی کہ ویدوں کی تاریخ،اس زمانہ قدیم میں کئی معروف بد عنوان افسران کا تذکرہ تاریخ میں موجود ہے۔ رابرٹ کلائیو(Robert Clive)سنہ ۱۷۷۲ء سے اس پر ہندستان میں دورانِ قیام بھاری املاک بنانے کا مقدمہ بھی چلا اور وزیر اعظم برطانیہ لارڈ نارتھ نے از خود اس کے خلاف ووٹ کا استعمال کیا۔ وارن ہیسٹنگز(Warren Hastings) بھی برصغیر پاک وہند میں قیام کے دوران متعدد بد عنوانیوں کا مرتکب ہوا۔ جس کے ضمن میں اس پر سات سال تک مقدمہ چلایا گیا۔ مذکورہ بالا افسران کے علاوہ کنگا گووند سنگھ مہراج نند کمار ،امی چند اور جگت سیٹھ بھی بد عنوان افسران کی فہرست میں شامل ہیں۔ تاریخ یہ بھی انکشاف کرتی نظر آتی ہے کہ رابرٹ کلائیو(Robert Clive)نے ۱۱ لاکھ ۷۰ ہزار ڈالر کی رشوت لی اور ۱ لاکھ ۴۰ ہزار ڈالر کی سالانہ بطور نذرانہ وصولی لی۔ ارتھ شاستر (مصنف آچاریہ چانکیہ مترجم شان الحق حقی) میں بد عنوانی کے مختلف نوعیت کے حامل طریقوں کو احاطہ تحریر میں لایا ہے جن میں زیادہ تر سرکاری افسران کے سرکاری واجبات کے غبن اور دوسری متعدد انواع کی ترغیبات کو مفصل انداز میں سپرد قلم کیا گیا ہے۔ آچاریہ چانکیہ نے اب سے قرنوں پہلے قبل مسیح میں بد عنوانی اور سرکاری ملازمتوں میں غبن اور اس سے متعلقہ ترغیبات کے جو رموزِ انشا اس معرکتہ آلارا تصنیف میں مندرج ہیں،وہ عصر حاضر کے اہل قلم کے لیے بھی توجہ طلب ہیں۔ غبن کے ضمن میں وہ یوں رقمطراز ہیں: ''اگر کوئی سرکاری ملازم کسی بڑی رقم کے ایک حصے کے غبن کا مرتکب پایا جائے تو اسے پوری رقم کی جواب دہی کرنی ہوگی۔''(۳۰)

سلطنت چندر گپت موریہ جو بڑے دبدبے اور جاہ وجلال کے ساتھ ۲۴ برس تک برسرِ اقتدار رہا، میں بھی بد عنوانی کا تذکرہ تاریخ میں رقم کیا جا چکا ہے۔ درحقیقت کوئی بھی دور، سلطنت یا عہد اس معاشرتی کج روی سے خالی نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ مغلیہ دورِ حکومت میں بھی متعدد امثال سرکاری ملازمتوں کی بد عنوانی کو

منظر عام پر لاتی ہیں۔ برطانوی سلطنت بھی اس قباحت کا اپنی سرکاری ملازمتوں میں سے قلع قمع نہ کر سکی۔ حقیقتاً ایسٹ انڈیا کمپنی میں بدعنوانی اس عہد کی بدعنوانی کا انعکاس کرتی رہی کہ اس گزشتہ عہد کا انگلستان بدعنوانی(Corruption)، رشوت(Bribery) اور اقرباپروری کا گہوارہ بن چکا تھا۔ ان تمام مذکورہ بالا حالات میں تبدیلی اس وقت ظہور پذیر ہوئی کہ جس دور میں برصغیر پاک وہند ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط سے نکل کر برطانوی راج کے زیر نگیں ہوا۔ تاہم یہ کہنا بجانہ ہو گا کہ برطانوی عہد میں بدعنوانی اپنی جڑیں مضبوط کر چکی تھی۔ جس کے خدوخال کچھ اس نوعیت کے حامل تھے۔ افسران بالا اپنے ماتحت(Subordinate) ملازمین کے اس منفی کردار کی سرزنش نہیں کرتے تھے کہ ماتحت خود کی کفالت اور اپنے گھوڑوں کی خوردونوش خوب کرتے رہیں۔ بصورت دیگر یہی افسرانِ بالا زیر تربیت آئی۔ سی۔ ایس افسران اور اپنے ماتحت آئی۔ سی۔ ایس افسران کی سرزنش کے ساتھ ساتھ ان کو تنبیہ بھی کی جاتی۔ اگر وہ کسی فرد سے ایک تربوز یا دودھ کا ایک گلاس بھی لینے کے متحمل ہوتے۔ تاہم اعلیٰ عہدیداران اس امر کے مجاز قرار پائے کہ وہ عوام سے قیمتی تحائف کی وصولی بھی کر سکتے تھے کہ جو ان کے عزیز و اقارب ہوں یا پھر ان کی معاونت کی ہو۔، متعدد وائسرائے اور تاجِ برطانیہ کے گورنر جن میں برِصغیر پاک وہند کے مہاراجوں، نوابوں، راجاؤں اور شہزادوں سے براہِ راست تحائف کی وصولی کی جرات واستبداد کا فقدان تھا، اپنی بیویوں اور بیٹیوں کی وساطت سے تحائف کی قبولیت کی سرزنش نہ کی جاتی بلکہ قطع نظری اختیار کی جاتی۔

گزشتہ صدی کی تیسری دہائی میں کساد بازاری کی بدولت برِصغیر پاک وہند میں بدعنوانی میں کمی کا رجحان پایا گیا۔ جس کا سب سے بڑا محرک منڈی سے روپیہ کا غائب ہو جانا اور تنخواہوں میں کٹوتی(Deduction) کا روزمرہ کا معمول تھا۔ عوام کے پاس اپنی کفالت اور ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے بھی رقم نہیں تھی تو اس صورت میں دوسروں کو قطعی ناممکن تھا۔ تاہم تاریخ کی ورق گردانی سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مملکتِ پاکستان کے دنیا کے نقشے پر ابھرنے تک بدعنوانی کسی نہ کسی صورت میں نچلی سطح پر موجود تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ ۱۹۴۵ء میں جب ایک ڈپٹی کلکٹر رشوت لینے کے جرم میں گرفتار کیا گیا تو سماجی سطح پر بہت واویلا مچا اور پورا انتظامی ڈھانچہ تنقید کا نشانہ بنا اور چہار سو غم وغصے کی لہر دوڑ گئی۔ تاہم رشوت کا مکمل طور پر خاتمہ نہ ہو سکا۔ متذکرہ عہد میں رشوت کی اصطلاح کے ساتھ ساتھ ''بخشیش'' کی اصطلاح بھی مستعمل

تھی تاہم بخشیش کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی۔یوں کہنا بے جانہ ہوگا کہ نوآبادیاتی عہد میں بدعنوانی پسِ منظر میں رہی جس کے اسباب و محرکات شاید درج ذیل تھے:

۱۔انتظامی ڈھانچے کے اعلیٰ عہدیداران قبائلی یاخاندانی دباؤ سے مبراء تھے۔

۲۔باہمی تقابل اور ترغیبات کے قوی امکانات موجود نہیں تھے۔

۳۔اعلیٰ عہدیداران کااپنے ماتحت طبقات پر انتظامی دباؤ سخت تھا۔

۴۔بدعنوانی کے اثرات(Impacts)عام زندگی یاعام لوگوں پر بہت محدود نوعیت کے تھے۔

۵۔عوام کی بدعنوانی کے ضمن میں روایتی قوت برداشت خاصی مضبوط تھی۔

تشکیل پاکستان کے فوراً بعد یعنی مابعد نوآبادیاتی عہد میں حالات نے تیزی سے پلٹا کھایا۔جیسے ہی انتظامی امور سے متعلق اقتصادی منصوبہ بندی اور سرکاری منصوبہ جات کے تکمیلی مراحل سے متعلق عملدرآمد کی ذمہ داری پاکستانیوں پر عائد ہوئی،بدعنوانی کا وہ سرا''پاک لوگوں کی سرزمین''کے افق پر نمودار ہوتا دکھائی دیااور برسات کے سرمئی بادلوں کی مانند پورے افق کو سیاہ تاریکی میں مقید کر گیا۔پاکستان میں بدعنوانی کی تاریخ کا خصوصی پہلو یہ ہے کہ اس کی رسائی بلند سے بلند تر طبقات تک پہنچ گئی اور عصر حاضر یعنی مابعد نوآبادیاتی دور میں بھی وہی خاص طبقہ حکمرانی کر رہا ہے جس کو برطانوی عہد میں بھی انگریزوں کا آشیر باد حاصل رہااور انہی کا پسندیدہ طبقہ آج بھی مسلط نظر آتا ہے۔نزاکت اقبال اپنے مقالے''لندن کی ایک رات،نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی مطالعہ''میں اس نقطہ نظر کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''۱۹۴۷ء سے قبل ہمارے حکمرانوں اور بیوروکریسی کو مشکل نہیں تھی۔انگریز برِصغیر میں ان کی خاص مقاصد کے تحت ذہن سازی کے بعد انہیں منصب سونپتے تھے۔''(۳۱)

انڈیا میں قائم شدہ سنٹرل ویجیلینس کمیشن(Central Vigilance Commision) کے ایک نمائندہ آر۔کے۔ترویدی(R.K Trivedi)کو مطابق بدعنوانی اور اس کی سطح مابعد نوآبادیاتی عہد میں تبدیل ہوگئی اور اعلیٰ طبقات تک پہنچ گئی اور بیوروکریسی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔حالانکہ اگر دیکھا جائے تو نوآبادیاتی عہد میں بھی اس کی جھلک واضح دکھائی دیتی ہے۔نزاکت اقبال اس ضمن میں یوں رقمطراز ہیں:

''اعلیٰ طبقہ سے مراد یہاں وہ طبقہ ہے جن کو نو آبادیاتی دور میں جاگیروں سے نوازا گیا۔ بادشاہ کا ساتھ دینے والوں یا آزادی پسندوں سے نو آبادکار نے سب کچھ چھین لیا۔ کسی کے پاس تھوڑی بہت زمین تھی بھی تو اس پر بہت زیادہ ٹیکس لگادیا گیا اور ان کی زمینیں اپنے حلیفوں میں بانٹ دی گئیں اور انہی حلیف جاگیرداروں سے ہی لوگ انگریزی پڑھ کر بیوروکریسی میں گئے اور عوام کو پوری طرح لوٹنے میں نو آبادکار کے لیے آلہ کار بنے اور مراعات حاصل کیں۔ وہی طبقہ آج پاکستان کی رگوں سے خون چوس رہا ہے۔''(۳۲)

ج۔ اردو ناول میں افسر شاہی کی قباحتوں کی عکاسی کی روایت

ناول بظاہر پرکشش اور سحر انگیز کرداروں اور خیالات کا مجموعہ ہے۔ تاہم باطنی طور پر وہ اشرف المخلوقات کو واضح حقیقت کے پس پردہ محرکات کے مطابق کے طور طریقے بھی سکھاتا ہے۔ سماجی زندگی کی بنیادی حقیقتوں کے بیانیے کے ساتھ ساتھ کرداروں کے پیچھے ایک فکری سوچ کارفرما ہوتی ہے۔ ناول کے بنیادی اجزا زبان و بیان، پلاٹ، کرداروں کی نوعیت، طرز بود و باش، موضوع، مواد، قصے، الفاظ و تراکیب، محاورات اور واقعات کو پس پشت رکھ کر ناقدانہ نگاہ ڈالی جائے تو وہ فکری سوچ اکثر و بیشتر سماجی حالات و واقعات کی عکاس دکھائی دیتی ہے۔ سماجی حالات و واقعات پر مبنی ناول کی تعریف و توضیح کرتے ہوئے عظیم الشان صدیقی اپنی کتاب ''اردو ناول آغاز وارتقاء'' میں اپنا نقطہ نظر کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''سماجی ناول میں محض کسی گھر، خاندان یا کسی طبقہ کی زندگی کو پیش نہیں کیا جاتا بلکہ اس میں سماج کے مختلف شعبہ ہائے زندگی مذاہب، عقائد، شادی بیاہ کی تقریبات، رسومات، معاشی مسائل، طبقاتی امتیازات، نظریاتی اختلافات، تفریحی مشاغل، سماجی برائیاں اور خوبیاں بیان کی جاتی ہیں اس قسم کے ناول کو محدود عصری یا معاشرتی ناول بھی کہہ سکتے ہیں۔''(۳۳)

ہر معاشرہ بنیادی طور پر ایک مخصوص تاریخ کا آئینہ ہوتا ہے جس میں صرف واقعات ہی ظہور پذیر نہیں ہوتے بلکہ تہذیبی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی تغیر و تبدل کی بدولت جنم لینے والی انقلابات اور رجحانات کو اپنے اندر سموتی ہے جس کا اظہار یہ اس عہد اور معاشرے کا ادب ہوتا ہے۔ یہ غیر مسترد حقیقت ہے کہ ایک زندہ و

جاوید معاشرے کا ادب زندہ حقائق کو ظاہر نہ کرے۔ بقول وقار عظیم: ''زندگی کے گہرے مشاہدوں، فکر کی سنجیدگی اور فن کی کاوشوں نے مل کر کسی اردو ناول کو متاثر کیا ہے۔''(۳۴)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد بیسویں صدی کے اوائل اور انیسویں صدی کے آواخر میں حالات نے بڑی سرعت کے ساتھ پلٹا کھایا۔ حالات کے تغیر و تبدل کے ساتھ طبقات کی نئی تقسیم (اعلیٰ طبقہ ''طبقہ اشرافیہ''، متوسط طبقہ، ادنیٰ طبقہ) کا ظہور ہوا۔ سماجی حالات کی اس تبدیلی کی عکاسی رفتہ رفتہ ادب میں ہونے لگی۔ خصوصاً تہذیبی، سماجی اور سیاسی عوامل کا اظہار ہم ناول میں دیکھ سکتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں اردو ناول میں ۱۸۷۵ء کے غدر کے بعد نئے موضوعات نے جنم لیا اور اس عہد کے تہذیبی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی شعور کا وسیع تناظر میں اجمالی جائزہ لے سکتے ہیں۔ اگر ادبی نقطہ نظر سے برصغیر پاک و ہند میں اردو ناول کے شواہد کی بات کریں تو ۱۸۵۷ء کے بعد ناول میں طبع آزمائی کی گئی۔ اس عہد کا ناول اپنے سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی شعور سے آراستہ ہے۔ جس میں بتدریج ارتقاء کا عمل ظہور پذیر ہوا اور اظہار کے نئے پہلوؤں نے جنم لیا۔ اس ضمن میں روبینہ سلطان یوں رقمطراز ہیں:

> ''ناول میں تنوع کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مادہ روح پر غالب آگیا ہے جس کے نتیجے میں مذہب سے دوری، روحانی کرب، ہمہ گیر مایوسی، یاسیت، قنوطیت، موت کی خواہش، ٹوٹے رشتے، زندگی کی پیچیدگیاں، غربت، مفلسی، استحصال، ایٹمی جنگ کی لٹکتی تلوار، دہشت گردی، خودکشیاں، نئے جان لیوا مسائل، ہمہ گیر ناآسودگیاں اور بے شمار خارجی و داخلی مسائل جن کا حل انسانی دسترس سے باہر ہے۔ فکشن میں نئی تبدیلیوں کا باعث بنا۔''(۳۵)

اردو ناول میں افسر شاہی کی قباحتوں کی عکاسی کی روایت وہ تمام پس منظری ماحول ہے جس نے اردو ناول کے لئے راہ ہموار کی۔ استعمار زدگی کے دور میں دوسری مقامی زبانوں کی طرح اردو میں صنف ناول کا آغاز ہوا۔ اگر انیسویں صدی میں اشاعت پذیر ہونے والے ناولوں پر ناقدانہ نگاہ ڈالی جائے تو وہ ان اکتسابی رویوں کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''ابن الوقت'' جو کہ ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا، کا واقعہ جنگ آزادی ۱۸۷۵ء کے فوراً بعد کا ہے۔ زیر نظر ناول کا ایک کردار ابن الوقت دورانِ جنگ ایک انگریز کی جان بچانے، اسے اپنی پناہ میں رکھنے اور اس کے ساتھ ہمدردانہ رویے کی عوض ابن الوقت کو جاگیر کے علاوہ اسسٹنٹ

کمشنر کے عہدے پر بھی فائز کر دیا جاتا ہے۔ انگریزی طرز کی بود و باش پر دیسی حلقوں کے افراد اس سے قطع تعلقی کر لیتے ہیں۔ مسٹر نوبل کی یورپ کی روانگی کے بعد ابن الوقت مصائب اور اضطرابی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ ایک ہندو کی سازش کی وجہ سے کلکٹر اس کے خلاف ہو جاتا ہے۔ مخالفت پرستی کی ایک پر سوز فضا دفتر میں قائم ہو جاتی ہے۔ لیکن کلکٹر دشمنی اور مخالفت کے باوجود بھی وہ ابن الوقت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا کیونکہ:

> ''غدر کی خیر خواہیاں سرکار کے دفتر میں چڑھ چکی تھیں اور نوبل صاحب کا بڑا زبردست کھونٹا'' حکام بالا کی نظر میں اس کا مقام بلند کرنے کے لیے کافی تھا۔''(۳۶)

ناول کا یہ اقتباس سرکاری انتظامیہ کے دفاتر میں سفارش کی حاکمیت کا بھرپور عکاس ہے۔ جس کا وجود مابعد نوآبادیاتی عہد میں بھی قائم ہے۔ جب ابن الوقت معاشی اور دفتری مسائل سے دوچار ہوتا ہے تو اس وقت ڈپٹی نذیر احمد ایک مسلمان سرکاری افسر کو ناول کے بیانیے میں شامل کرتے ہیں جس کا نام حجتہ الاسلام ہے۔ حجتہ الاسلام ابن الوقت کے روبرو سرکاری انتظامیہ کی پالیسی سازی سے متعلق سوالات واعتراضات اٹھاتا ہے۔ اسی طرح سر رشتہ دار نامی کردار کلکٹر کو ابن الوقت کے خلاف بھڑکاتا ہے اور اس کے خلاف متعدد ریشہ دوانیوں اور سازشوں میں مصروف عمل رہتا ہے۔ جو کہ سرکاری دفاتر میں ہونے والی سازشوں کی عکاسی ہے۔ اس سازش کی بنا پر کلکٹر ابن الوقت کے خلاف ہو جاتا ہے۔

برِصغیر پر انگریزی تسلط کے بعد جو نیا نظام متعارف کروایا گیا تو اس میں قوانین وضوابط اور محکمہ پولیس کی پیچیدہ نوعیت کی حکمت عملیاں ایسی تھیں کہ مقامی لوگ ان بھول بھلیوں میں کھو کر رہ جاتے۔ تفتیشی عمل اور عدالتی نظام میں ضابطے کی کاروائی میں لوگ چکرا کر رہ جاتے۔ اس عہد میں لکھے جانے والے ناولوں کے بعض کردار اس قسم کے نظام پر تنقید کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر رتن ناتھ سرشار کے ناول ''سیر کہسار'' کا ایک رحمانی نامی نسوانی کردار اس نئے متعارف کردہ نظام پر اعتراض کرتا نظر آتا ہے۔ اس نئے نظام کے مطابق اگر کسی کے گھر میں چوری کی واردات ہو جاتی ہے تو اس پر گواہ لانے کا حکم صادر کیا جاتا ہے۔ جس پر کردار ''رحمانی'' کا نقطہ نظر ملاحظہ کیجیے:

> ''اب تو پوچھتے ہیں کہ کوئی گواہ ہے۔ چوری کرتے کس نے دیکھا، گواہ لاؤ۔ اب بتاؤ گواہ کہاں سے لائیں۔ چور چوری کرنے آئے گا کہ محلے والوں کی گواہی بننے۔ اب جس بچارے کے ہاں چور پکڑا جائے۔ وہ گواہ کہاں سے لائے کہ انہوں نے چوری کرتے

دیکھا تھا اور مہینوں کی دوڑ دھوپ الگ۔ آج نخاس جا کے گوڑی بازار دیکھو، کل تھانے پر
جاؤ، پرسوں چوکی پر جاؤ، بندھے بندھے پھرو۔''(۳۷)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے اردو ادب میں داستان گوئی مروج تھی۔ داستان گوئی کی دنیا سے باہر حقیقی دنیا میں دیکھیں تو برصغیر پاک و ہند پر برطانوی سامراج کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ عوام الناس میں ایک اضطراب اور بے چینی کی فضا قائم تھی۔ وہ برطانوی تسلط سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انہی حالات میں کارل مارکس اور اینگلز کے تصورات نے جنم لیا اور سماج میں توجہ کا مرکز بن گئے۔ ہندستانی نظام میں تقریباً اسی نوعیت کی صورتحال انتظامیہ (Adminitration) میں بھی موجود تھی۔ نوآبادیاتی عہد کے بعد مابعد نو آبادیاتی عہد میں بھی یہی حالات دکھائی دیتے ہیں۔ خوف اور عدم تحفظ کی فضا مزید بڑھتی جا رہی تھی اور یہی عصر حاضر کی زندگی کا جیسے ایک طور بن چکی ہے۔ ۱۹۸۰ء اور اس کے آس پاس لکھے جانے والے ناولوں میں اس تمام صورتحال کی عکاسی کی گئی ہے۔ پیغام آفاقی کا ناول بعنوان ''مکان'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو کہ انتظامیہ کی قباحتوں اور بدعنوانیوں کی طرف قاری کی توجہ مبذول کرواتا ہے۔ دہلی اور بمبئی جیسے شہروں میں کرائے کے مکان سے متعلقہ امور مسائل کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ ان حالات میں مکان کی تعمیر تو ایک بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ چونکہ کرائے داروں کے حق میں قانون نافذ کیا جا چکا تھا اس لیے ان سے مکان خالی کروانا مشکل امر تھا۔ ناول ''مکان'' کی ضخامت چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ متذکرہ ناول کی ہیروئین ''نیرا'' میڈیکل کی طالبہ ہے جس کے کندھوں پر سارے گھر کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ماں ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ اختلاج جیسے موذی مرض میں بھی مبتلا ہے۔ نیرا کے والد کی وفات ہو جاتی ہے جس کے بعد نیرا کے کرائے دار کمار نے (جو کہ ایک دولت مند تاجر ہے) نے غیر قانونی طور پر سرکاری اعلیٰ افسران اور ایک لال اشوک کی معاونت سے پورے مکان ماسوائے وہ حصہ جہاں نیرا نے سکونت اختیار کی ہوئی تھی، پر قابض ہو گیا۔ نیرا کا تھانے میں کافی دیر تک کاروائی کے لیے انتظار کرنا، سب انسپکٹر کا اس سے بدتمیزی کرنا، آشوک کا نیرا پر اعلیٰ افسران کی معاونت کی بدولت اس پر مقدمے بازی کرنا، اس کے چچا اور دوسرے اہل خانہ کے لیے وارنٹ گرفتاری اور عدالت میں پیش ہونے کے سمن بھجوانا، محکمہ پولیس کے سرکاری افسران کا رشوت ستانی میں ملوث ہونا، یہ تمام ایسی قباحتیں ہیں جو تقریباً تمام سرکاری و غیر سرکاری محکموں میں نظر آتی ہیں۔ اس ناول کے تانے بانے میں جہاں سماج کے دوسرے افراد اور سرکاری ملازمین کی بدعنوانیوں کا ذکر ہے وہاں کچھ کردار سچے اور ایمان دار سرکاری افسران کی نمائندگی کرتے ہیں جن کی وجہ سے سچائی کی کوئی کرن دکھائی دیتی

ہے۔ مسز بتر ااور الوک کا کردار ان اعلیٰ سرکاری افسران کی نمائندگی کرتے ہیں جو دیانت اور سچ کی بدولت سماج سے برائیوں کا خاتمہ کرنے کی تگ ودو میں ہیں مگر دفتر کا نظام اور ارد گرد کا ماحول ان کو ہمہ وقت جکڑے رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے چاہتے ہوئے بھی حق کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس زیر نظر ناول میں افسر شاہی کی نظام کی قباحتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

مشرف عالم ذوقی کا ناول ''نیلام گھر'' جو کہ ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا، ایک ایسا ناول ہے جو عصر حاضر کی انتظامیہ کی بدعنوانیوں، معاشرتی برائیوں، سرکاری دفاتر میں افسر شاہی کے مظالم، محکمہ پولیس کے ملازمین کے جبر واستبداد کی کہانی ہے۔ نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی عہد میں نسلوں میں منتقل ہونے والی تبدیلیوں، تہذیبوں کا تصادم اور دیگر قباحتوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مذکورہ ناول کا ایک مرکزی کردار کریم بیگ ایک سرکاری ملازم ہے۔ وہ بھی اپنے دفتر کے دیگر ملازمین کی طرح دفتر کی ایک ملازمہ نیلا اور ایک اعلیٰ افسر کے تمام حدود کو تجاوز کرتے ہوئے قائم کردہ تعلقات کو ناپسند کرتا ہے۔ لیکن نیلا بھی عزت و تکریم کا خیال کیے بنا اس اعلیٰ افسر کی حامی بن جاتی ہے۔ یوں ایک روز نیلا اس افسری درندے کی ہوس کا نشانہ بن جاتی ہے اور خودکشی کی مرتکب ٹھہرتی ہے۔ دفتر کے دیگر ملازمین سراپا احتجاج نظر آتے ہیں لیکن ان کا افسر اپنے اعلیٰ عہدیداران کو دوسری نوعیت کی باتیں اس طریقے سے بتاتا ہے وہ اس کے اس گناہ پر پردہ ڈالتے ہیں اور ملازمین کے احتجاج کی نحیف و نزار آواز کو دبا دیتے ہیں:

> ''مس نیلی نے خودکشی کی ہے کسی نے مارا نہیں اس کو۔ احمقو۔ اس طرح چیخنے چلانے سے کیا ملے گا تمھیں۔۔۔۔۔۔ وہ تو ہم شریف ہیں کہ تمھیں گرفتار نہیں کر رہے۔۔۔۔ ورنہ تم لوگوں کو۔۔۔ انسپکٹر کے چہرے پر خون دوڑ گیا۔۔۔۔ تمہیں تو شہر میں امن کو درہم برہم کرنے کے الزام میں بڑے آرام سے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔۔۔۔ چہرے مزید سکڑ گئے۔۔۔۔۔ بھیڑ چھٹنے لگی۔۔۔۔ انسپکٹر کے جملے نے بندوق کی گولی کا سا کام کیا تھا۔۔۔۔ لوگ ایک ایک کر کے واپس جا رہے تھے اور انسپکٹر فخر و غرور کی علامت بنا مسکرائے جا رہا تھا۔''(۳۸)

نیلی کی لاش پوسٹ مارٹم کے عمل سے گزارنے کے بعد لاوارث لاشوں کے ساتھ رکھ دی جاتی ہے لیکن کریم نامی کردار نیلی عرف سلمیٰ کا منہ بولا بھائی ہے وہ اس کی لاش دفنانے کی غرض سے لاش کا تقاضہ کرتا

ہے۔ نیلی عرف سلمیٰ اس کے گھر کے ملازم جس کا نام رحیم چچا تھا، کی بیٹی ہے جو کچھ وقت پہلے گم ہو گئی تھی اور کریم کو دفتر میں نیلی کی صورت میں نظر آتی ہے۔ لیکن الٹا کریم کو اس تقاضے کے ضمن میں سزا کا مرتکب ٹھہرایا گیا۔ جیل سے اس کی ضمانت بھی نیلی کا افسر ہی کراتا ہے کیونکہ اس کو اپنے گناہ کا راز افشاء ہونے کا احتمال تھا۔ نیلی کے بعد مس بھٹنا گر اسی اعلیٰ افسر کی منظور نظر قرار پاتی ہے۔ کریم دفتر کے تمام ملازمین کو اکٹھا کر کے جبر و استبداد کے خلاف سراپا احتجاج ہوتا ہے لیکن حکومتی افسران اس کے احتجاج کو فتنہ و فساد قرار دے کر اسے ملازمت سے سبکدوش کر دیتے ہیں۔ کریم کا کردار لوگوں کو حق اور سچ کی راہ پر گامزن ہونے کی دعوت دیتا ہے کیونکہ اس کے مطابق ظلم و جبر کے خلاف مجموعی طور پر صدائے احتجاج بلند کرنے سے ہی افسر شاہی کی بدعنوانی کا خاتمہ ممکن ہے۔ اسی طرح سب ملازمین اجتماعی طور پر مس بھٹنا گر کی موت پر افسر اعلیٰ کا گھیراؤ کر کے احتجاج کرتے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار کریم ملازمت سے سبکدوشی کے بعد مسجد میں امام کے فرائض سنبھال لیتا ہے۔ ناسازیِ طبیعت کے باعث بظاہر دین کے ٹھیکدار شاہ جی اسے امامت سے بھی فارغ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح زیر تجزیہ ناول میں نسلِ نو امت، نِمتا، پرشپال وغیرہ کے کردار ہیں جو جرم و استبداد کے خلاف آوازِ احتجاج بلند کرتے ہیں لیکن ان کی آواز کو پولیس کے ذریعے دبا دیا جاتا ہے۔ اس جرم کی پاداش میں کریم کے بیٹے کو جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ امِت اور نِمتا ایک ایسا فلاحی کیمپ لگاتے ہیں جہاں پر وہ ضعیف اور استحصال زدہ افراد کی دلجوئی اور خدمت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ آخر کار کریم موت کی آغوش میں سو جاتا ہے۔ اس کی موت کے بعد ہی انجم کو ضمانت کی بدولت رہائی نصیب ہوتی ہے۔ ناول نگار نے ایک ایسے المیے کی عکاسی کی ہے اور ایسی آزادی کی جستجو اور تگ و دو (جس کی کوئی آس باقی نہیں) کے برے نتائج کو واضح کیا ہے۔ کریم کی نسل کے تمام افراد کا یہ المیہ ہے کہ جاگیرداری سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ ملک تقسیم ہو کر دو حصوں میں بٹ گیا اور ایسے آزاد ملک کے لیے جو انہوں نے خواب بنے تھے ان کی تعبیر بھی فسادات اور معاشرے میں چہار سو پھیلی بدعنوانیوں کی نظر ہو گئے۔ نسلِ نو معاشرتی بدعنوانیوں کو ختم کرنا چاہتی ہے لیکن حکومت وقت انہیں لاقانونیت کی پاداش میں سزاوار ٹھہرا دیتی ہے۔ اس ناول میں ناول نگار نے افسر شاہی کے جبر و استبداد کو بنیاد بنا کر ایک اہم المیے کی جانب قاری کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ لیکن ناول کے آخر تک اس موضوع کو قائم نہ رکھ سکے کیونکہ ناول کے اختتامیہ میں افسر شاہی ہی فاتح قرار پاتی ہے اور ناانصاف اور بربریت اپنی جگہ قائم و دائم ہیں، تاہم اس پیشکش سے ناول نگار عوام الناس تک بے بسی کی جھلک اور تجزیہ کو منظر عام پر لاتا ہے تاکہ قارئین اور سامعین دفاتر میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں اور قباحتوں سے آشنا ہو سکیں۔ یہ بھی ایک ناقابل مسترد حقیقت

ہے کہ قباحتوں اور بدعنوانیوں کو ختم کرنا ناول نگار کے بس کی بات نہیں۔اس ناول کی پیشکش سے ہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ انتظامیہ میں تبدیلی لانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔کیونکہ جیسے ہی کوئی کردار سچائی اور حق کی راہ چلتا ہے تو اسے سازشوں میں جکڑ کر گرفتار کر لیا جاتا ہے۔مذکورہ ناول میں بدبو کا ذکر تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔درحقیقت یہ بدبو پورے نظام کا گھیراؤ کیے ہوئے وہ بدعنوانیاں ہیں جس کی تعبیریں سرکاری دفاتر کی افسر شاہی، پولیس کی بدانتظامی، رشوت اور فسادات وغیرہ بھی گردانی جاسکتی ہیں۔بدبو کو ناول میں بطور علامت پیش کیا گیا ہے۔۱۹۹۴ء میں منظر عام پر آنے والا الیاس احمد گدی کا ناول ''فائر ایریا'' ایک علاقائی ناول کے طور پر جانا جاتا ہے جو ایک بہار نامی علاقے میں کوئلے کی کان میں کام کرنے والے مزدوروں کے پیش آمدہ مسائل، کان کے مالکان، ٹھیکیداروں اور سرکاری افسران کی شاہانہ زندگی اور ،ان کی تمام مکاری و عیاری اور چالاکیوں کے تفصیلاً بیان کرتا ہے۔مذکورہ ناول میں ناول نگار نے نہایت باریک بینی کا عملی مظاہرہ کیا ہے۔ایک ہی ناول میں متعدد پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔جس میں مزدوروں کی زندگی کے ساتھ ساتھ دورانِ ملازمت پیش آمدہ مسائل، ٹھیکیداروں سے ان کا باہمی اختلاط، ٹھیکیداروں اور فیکٹری کے مالکان کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں،افسروں کی تعیش پرستی سب کا اتنا عمیق مطالعہ و مشاہدہ اور پھر ان کی عکاسی بھرپور انداز میں کی گئی ہے۔ناول ''فائر ایریا'' ۳۶۷صفحات پر محیط ہے اور اس کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔پہلا حصہ نوآبادیاتی عہد، دوسرا حصہ مابعد نوآبادیاتی عہد اور تیسرا حصہ کول مائنوں کو قومیانے کے بعد کے عہد پر مشمول ہے۔اس ناول کے تیسرے حصے میں استحصال کا طریقہ کار نوآبادیاتی عہد سے ذرا مختلف نوعیت کا تھا۔اس دور میں سب کچھ روپے پیسے اور رشوت ستانی کے بل بوتے پر ہونے لگا۔ملازمتوں کو از سر نو بحال کرنے کے لیے کول مائن کے سرکاری دفاتر میں رشوت کا تقاضا کیا جاتا۔

اقبال مجید کا پہلا ناول ''کسی دن'' جو کہ ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا اور اس کی ضخامت ۱۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔مذکورہ ناول کے ابتدائی صفحات ''سڑی ہوئی مٹھائی'' کے عنوان کے تحت 'سوغات' (بنگلور) کے شمارہ نمبر۔۱۰،اسی طرح 'تیر اور اس کا سچ' کے عنوان سے ،شب خون،(۲۰۳)فروری ۱۹۹۷ء میں اشاعت پذیر ہوئے۔موضوع کے اعتبار سے یہ ایک معاشرتی اور سیاسی نوعیت کا ہے۔معنویت کے لحاظ سے اس عصر حاضر کی معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی مسائل سے متعلقہ متعدد جہتیں موجود ہیں۔اس میں انسانی زندگی کی پیچیدگیوں اور مسائل کو حالیہ سیاسی صورتحال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ناول کے اداریے کا یہ انسانیت سوز اقتباس ملاحظہ ہو:

''سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اخلاقی اقدار بدل چکے ہیں۔ پوری ایمانداری کے ساتھ بے ایمانی ہو رہی ہے۔ پوری بے شرمی سے سیاست اور تشدد کا برہنہ کھیل ہو رہا ہے۔ جہاں رشتوں کا تقدس، نیکی کی قوتیں، انسانی و اخلاقی قدریں سب پامال ہو کر طاقت، دولت اور صارفیت کا حصہ بن رہی ہیں یا بن چکی ہیں۔''(۳۹)

ناول ہذا میں کمو، اکبری بیگم، شوکت جہاں اور دوسرے نسوانی کرداروں کی وساطت سے متعدد سوالات کو اٹھایا گیا ہے۔ بیسویں صدی کی عورت ترقی کی راہوں پر گامزن ہو کر سماج میں اپنی ایک پہچان قائم کرنا چاہتی ہے مگر اکثر اوقات اپنی شناخت بناتے ہوئے وہ سیاسی قائدین اور غیر ذمہ دار سرکاری افسران کی سازشوں کے بھنور میں گم ہو جاتی ہے۔

ناول ''خوابوں کا سویرا'' عبدالصمد کا تیسرا ناول ہے جس کی اشاعت ۱۹۹۴ء میں ہوئی اور متذکرہ ناول ۵۰۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ناول ہذا میں عبدالصمد نے روز افزوں بڑھتے سیاسی مسائل، معاشرتی زندگی کی پیچیدگیاں، سرکاری دفاتر میں رشوت ستانی، چور بازاری اور اس طرح کے دیگر مسائل کو دردناک واقعات میں سمو کر پیش کیا ہے۔ ناول کے نوجوان کردار انور، آفاق اور دوسرے کئی افراد بیروزگاری کی وجہ سے عالم اضطراب میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ انکم ٹیکس کے دوسرے ملازمین کو رشوت نہ دینے کی وجہ سے تجارتی شعبے میں بھی آفاق کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس اس کے نو دولتیے سوتیلے چچا دولت کے بل بوتے پر کامیابیوں سے ہمکنار ہوئے۔ آفاق کے والد کو اس کا ادراک ہو جاتا ہے کہ اب سماج کے ہر شعبے میں دولت اور مفاد پرستی نے اپنا تسلط قائم کر لیا ہے۔ ناول کا ان حقائق کو منکشف کرتا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''میں تو کافی عرصے سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ آزادی کے بعد مخصوص قسم کی تاجرانہ ذہنیت کو کافی فروغ ملا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب زندگی کے ہر شعبے میں کوئی نہ کوئی دکان کھلی ہوئی ہے۔ جہاں لین دین جاری ہے۔''(۴۰)

مندرجہ بالا چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو ناول نگاروں نے سماجی زندگی کے ناہموار گوشوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے افسر شاہی اور اس سے متعلقات کو بھی فراموش نہیں کیا اور مختلف زاویوں سے اس کے قبیح پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ہے۔

حوالہ جات

1.Kiran Khurshid,A Treatise on Civil Service of Pakistan,The Structural-Fuctional History(1601-2011),Pak TM Printers,Faisalabad,2011,p.1

2.Michael P.Barber,Revised by Roger Stacey,M4E International(Student Edition 1983),Services book Club,1987,P.85

3. Ibid P.86

4.Kiran Khurshid,ATreatise on Civil Service of Pakistan,The Structural-Fuctional History(1602-2011),P.3

۵۔خورشید صدیقی، جدید منتظمیت، غضنفر اکیڈمی پاکستان، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۰۲

6.Michel Crozier,The Bureacratic Phenomenon,Transaction Publishers New Brunswick(U.S.A) and London(U.K).1964,P.3

۷۔مشتاق احمد وجدی،، مسئلہ ارتقاء، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، س۔ن، ص ۵

8.Kiran Khurshid,A Treatise on Civil Service of Pakistan,The Structural-Functional History(1601-2011),P.5

۹۔شان الحق حقی (مترجم)، ارتھ شاستر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۷

۱۰۔ابنِ حسن، سلطنتِ مغلیہ کا مرکزی نظام حکومت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، 1982ء، ص156

۱۱۔ایضاً، ص159

۱۲۔ایضاً، ص160

۱۳۔شمس الرحمٰن فاروقی، تعبیر کی شرح، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۹۴

۱۴۔لطف الرحمٰن،مابعد نوآبادیاتی تہذیبی جارحیت (مضمون)،، مشمولہ ''نوآبادیات ومابعد نوآبادیات (نظریہ،تاریخ، اطلاق)، تحقیق وترتیب، محمد عامر سہیل، عکس پبلیکیشنز،۲۰۱۹ء، ص۷۷

۱۵۔سید محمد حفیظ قیصر، سول سروسز اور بیوروکریسی (انتساب)، جلد اول، ممتاز پبلشنگ لاہور،۲۰۰۷ء، ص۵

۱۶۔عنایت الہیٰ ملک، پاکستان میں انتظامیہ کا زوال، مشعل لاہور، ۲۰۰۰ء، ص۱۷۲

۱۷۔ایضاص ۱۷۱

۱۸۔ایضاص۱۷۵

۱۹۔ایضاص۱۷۵

20.Syed Abdul Quddus,Bureaucracy and Management in Pakistan,Royal Book Company,1991,P.53

21. Ibid, P.53

۲۲۔محمد علی خالد، جی۔ایچ۔کیو سیاست، مسیحا پبلیکیشنز حیدر آباد،۱۹۸۸ء، ص۲۴۲

۲۳۔محمد رفیق شیخ، تاریخ پاکستان وہند، سٹینڈرڈ بک ہاوس،۱۹۹۳ء، ص۳۷۴

24.https:// dictionary.cambridge.org

25.https:// Webster's New World College Dictionary

۲۶۔کنسائز اردو ڈکشنری، اے۔آر قریشی، الحسنات بکس پرائیویٹ لمیٹڈ

۲۷۔فیروز الدین، الحاج مولوی، مرتب، فیروز اللغات اردو جامع، فیروز سنز، لاہور، ص۱۸۸

28.https://www.merriam.webster.com

29.Pakistan Penal Code(XLV of 1860).6th October,1860,P.72-76

۳۰۔آچاریہ چانکیہ، ارتھ شاستر، شان الحق حقی(مترجم)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی،۱۹۹۹ء، ص۸۷

۳۱۔ نزاکت اقبال، مقالہ نگار، لندن کی ایک رات (نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی مطالعہ)، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۲۱

۳۲۔ ایضاً ص ۲۴

۳۳۔ عظیم الشان صدیقی، اردو ناول کا آغاز وارتقاء (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۵ء)، بک ٹک لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۵۱

۳۴۔ وقار عظیم، اردو ناول کا ارتقاء، اذکار کراچی، دسمبر ۱۹۶۸ء، ص ۹۸

۳۵۔ روبینہ سلطان، تین نئے ناول نگار، دستاویز لاہور، س۔ن، ص ۲۴

۳۶۔ نذیر احمد، ڈپٹی، ابن الوقت، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء، ص ۲۲۰

۳۷۔ رتن ناتھ سرشار، سیرِ کہسار، مطبع منشی نول کشور ۱۹۳۴ء، ص ۱۰۲

۳۸۔ مشرف عالم ذوقی، نیلام گھر، تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۹۳۔ ۹۴

۳۹۔ علی احمد فاطمی، ڈاکٹر، کسی دن (اداریہ)، نیا سفر پبلیکیشنز، الٰہ آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۴

۴۰۔ عبدالصمد، خوابوں کا سویرا، مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، ۱۹۹۴ء، ص ۳۳۵

باب دوم

افسر شاہی میں نظام کی قباحتیں اور معاصر اردو ناول میں ان کی عکاسی

الف۔افسر شاہی میں نظام کی قباحتیں

i. افسروں کو ان پڑھ سیاسی لوگوں کے ماتحت کرنا

ملکوں کی بد عنوانی پر غور و غوض کرنے والی ایک بین الاقوامی تنظیم کی سال ۱۹۹۹ء میں ہونے والی مساحہ (Survey) اس پر منتج ہے کہ پاکستان میں دور حاضر میں مروج ضلعی نظام کے لاگو ہونے کے بعد اس ملک میں بد عنوانی میں روز افزوں اضافہ ہوا ہے۔ بعض اوقات یہ مشاہدے میں آتا ہے کہ ہمارے سماج میں اصول وضوابط کے مسائل سیاسی دشمنیوں کی بدولت جنم لیتے ہیں۔ جن کا ممکنہ حل جانبدار سیاسی ناظمین کی پہنچ سے بالاتر ہوتا ہے۔ یہ مشاہدہ اکثر اوقات حقیقت کا روپ دھارتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ جن شخصیات کا اپنا ایک سیاسی موقف ہو ان سے مختلف سیاسی مکتبہ فکر رکھنے والے لوگوں کے لیے عدل وانصاف کی آس اور امید رکھنا خام خیال ہو سکتا ہے۔ پاکستان کی اعلیٰ بنیادوں پر فائز سروس (Civil Service of Pakistan) کے انتہائی ذہین وفطین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ممبران سے منتخبہ ڈپٹی کمشنر کو ایک میٹرک کی سطح کی تعلیم کے حامل سیاسی وڈیرے کا ماتحت بنا دینا ایسا ہی ہے جیسے ضلعی سطح کے بلدیاتی کونسلرز کی اکثریت رکھنے والے ایک جونیئر کلرک (LDC) کو DC کا افسر اعلیٰ بنا دیا جائے، حاکمیتی سطح کی بنیادی سیڑھی پر افسروں کو ان پڑھ سیاسی لوگوں کے ماتحت کرنا ایک ایسی قباحت ہے جو حقیقت میں کرپشن، بد عنوانی اور نااہلی کا منبع ثابت ہوتی ہے۔ خصوصا ایسے حالات میں جہاں ضلعی سطح پر محتسب تعیناتی کا عمل یکسر موجود نہیں اور مملکت کے غیر سیاسی عہدوں پر فرائض منصبی انجام دینے والے آفیسرز اپنی حلف برداری سے قطع نظری کرتے ہوئے مختلف سیاسی پارٹیوں کے حامی بن جائیں۔ درج بالا قباحت کی عکاسی کے ضمن میں لیفٹیننٹ جنرل عبدالقیوم ملک (ر) یوں رقمطراز ہیں:

> ''یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں کا اپنا سیاسی ایجنڈا ہو ان سے مختلف سیاسی مکتبہ فکر کے لوگوں کے لیے انصاف کی توقع رکھنا خام خیالی ہو گی۔ پاکستان کی چوٹی کی سروس (CSP) سے نکلی ہوئی انتہائی ذہین اور پڑھے لکھے آفیسرز کی کریم سے چنے

ہوئے ڈپٹی کمشنر کو DCO کے لبادے میں ایک میٹرک پاس سیاسی وڈیرے کے نیچے لگا دینا ایسے ہی ہے جیسے ڈی۔سی کے دفتر میں کام کرنے والے جونئیر کلرک (LDC) کو اس لیے DC کا اعلیٰ آفیسر بنا دیا جائے کیونکہ ضلع کے بلدیاتی کو کونسلر کی اکثریت اس کے ساتھ ہے۔"(۱)

ii. نظام کی سست روی

افسر شاہی یا دفتر شاہی (Bureaucracy) بھی انتظامی امور کی انجام دہی کا ایک طرز ہے جو مختلف حکومتوں کے زیر سایہ روایتی طور طریقوں میں پروان چڑھا ہے۔ جس میں بنیادی مقاصد کی اہمیت، حصول اور تکمیل سے بے اعتنائی کا رویہ دیکھنے میں ملتا ہے جبکہ اس کے طریقہ کار اور روایتی ضابطوں کی تکمیل کو اولین ترجیح دی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے سرکاری محکموں میں تمام امور روایتی طور پر لگے بندھے ضابطوں اور طریقہ کار کے مطابق نہایت سست رفتاری سے انجام پذیر ہوتے ہیں اور اس سست روی کا محرک ضابطوں اور طریقہ کار کی طوالت کا سرخ فیتہ (Red Tap) ہے۔ جس میں سرکاری محکموں کی کارکردگی کے کنٹرول کے نظام کے فقدان کے باعث چار چاند لگ جاتے ہیں جو کہ عوام کی پریشانیوں میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں گزشتہ قدیم طرز کا تنظیمی ڈھانچہ ضروری تبدیلیوں کے بغیر روایتی طرز پر امور کی انجام دہی کا کام کر رہا ہے۔ اس ضمن میں کرن خورشید کا یہ تجزیہ چشم کشا ہے:

"It has been generally abserved that the bureaucracy has a tendency for self aggrandizement and despotism.It shuns initiative,discourages creativity and strives to maintain status quo.Rigidity of procedures results in red-tapism."(2)

سرخ فیتے کی اصطلاح سرکاری دفاتر میں ضابطہ کی کارروائی میں التوا یا ضروری احکامات جاری کرنے میں غیر ضروری التوا ہے جس کی وجہ سے عوام کو ضابطوں کی کارروائی کے چکر میں پھنسا دیا جاتا ہے۔ سرخ فیتہ

انتظامی سطح پر فیصلہ سازی کے عمل کو متاثر کرتا ہے۔ پاکستانی سماج میں ہم کئی سطحوں پر سرخ فیتے کا مشاہدہ کرتے ہیں خصوصاً افسر شاہی کی تمام سطحوں میں اس کا وجود قائم ہے چاہے وہ حکومتی سطح ہو یا ذاتی ہر جگہ سرکاری عہدیداران رشوت کا تقاضا کرتے نظر آتے ہیں۔ طارق مسعود اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "Because of complicated and lengthy rules and regulations our office work is inefficient and slow which helps illegal gratification and bribery to thrive."(3)

عموماً یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اس اصطلاح کا آغاز سپین کے "چارلس وی"(Charles V) کے انتظامی ڈھانچے کے ساتھ ہوا۔ سولہویں صدی کے آغاز میں ہسپانوی سلطنت اور سلطنتِ رومہ کے بادشاہوں نے انتظامیہ کو جدید اصولوں پر استوار کرنے کی غرض سے سرخ فیتے کا استعمال کیا۔ ان کی مروجہ انتظامیہ ایک وسیع سلطنت کو چلانے پر معمور تھی۔ ایسے تمام انتظامی امور جو فوری فیصلہ سازی کے متقاضی ہوتے ریاستی کونسل ان کو سرخ فیتے سے باندھ دیتی تھی۔ ان کو ایسے تمام انتظامی امور سے الگ کر دیا جاتا تھا جن کی انجام دہی کے لیے عمومی طریقہ کار درکار ہوتا ۔ عمومی طریقے سے حل کیے جانے والے معاملات کی دستاویزات کو عام پٹی سے باندھا جاتا تھا۔ اگرچہ دوسری مغربی ریاستیں اتنی وسیع سلطنت کے انتظامی امور کو نہیں چلاتی تھیں جیسا کہ چالس وی۔ لیکن وہ بھی عوامی ضابطے کی کاروائی کی دستاویزت کو سرخ فیتے کی مدد سے الگ کر دیتی تھیں تاکہ کام کی رفتار کی شرح میں اضافہ کیا جا سکے۔ یہ رواج سترہویں اور اٹھارویں صدی میں بھی قائم رہا۔ اس طریقہ کار نے تھامس کارلائل(Thomas Carlyle) کے دور میں زور پکڑا۔ وہ بھی سرکاری دستاویزات کو سرخ فیتے سے باندھ دیتے تھے۔ بیسویں صدی کے آواخر اور اکیسویں صدی کے آغاز سے سول سرونٹس کمپیوٹر اور دوسری جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کر رہے ہیں۔ اس کی بدولت جدید طرز سے انتظامی امور کی انجام دہی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ ہسپانوی سلطنت کی اعلیٰ سطح کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ایسی فائلوں کو سرخ فیتے سے باندھ دیتے ہیں۔ اس کی مثال ہسپانوی سلطنت کی ریاستی کونسل کے معاملات کی فائلیں ہیں۔ دوسری طرف ہسپانوی سلطنت کی نچلی سطح کی عدالتیں اپنی دستاویزات کو عام فیتے سے باندھ کر الگ کرتی ہیں۔ جن پر ضابطے کی کاروائی اعلیٰ سطح پر نہیں ہوتی۔

اکیسویں صدی کے اوائل تک ہسپانوی بیوروکریسی کو غیر معمولی حد تک کے استعمال پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا جانے لگا۔ جس میں بہت سے اہم معاملات التوا کا شکار ہو جاتے۔ دورِ حاضر میں سرخ فیتہ انتظامی سطح پر امور کی انجام دہی میں سست روی کے عنصر کو ظاہر کرتا ہے تاہم سرخ فیتے کی اصطلاح مثبت اور منفی دونوں معنوں میں متصور کی جاسکتی ہے۔ اس اصطلاح کو منفی معنوں میں اس وقت متصور کیا جاتا ہے جب بیوروکریسی کے انتظامی امور بے جا تاخیر کا شکار ہوتے ہیں حالانکہ سرخ فیتے کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اولاً سرخ فیتہ انتظامی معاملات کی جانچ پرکھ اور ان میں توازن برقرار رکھنے کا نام ہے۔ ثانیاً کہ انتظامی منصوبہ بندی پر طائرانہ نگاہ رکھی جاتی ہے کہ تمام امور مناسب طریقے سے تکمیلی مراحل طے کر رہے ہیں یا نہیں۔ ورثے میں ملنے والی سرخ فیتے کی اصطلاح بری نہیں ہے تاہم اس کا اطلاق غلط طریقے سے کیا جاتا رہا اور اب بھی ایسی ہی صورتحال دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس طریقہ کار کو صحیح معنوں میں بروئے کار لانے کا ایک حل یہ ہے کہ دیکھا جانا چاہیے کہ کون سے انتظامی معاملات فوری نوعیت کی فیصلہ سازی کے متقاضی ہیں اور کون سے معاملات معمولی نوعیت کے التوا کے متحمل ہو سکتے ہیں، یہ صرف توازن کا طریقہ اپنانے سے ہی بارآور ثابت ہو سکتا ہے۔ حکومت کی طرف سے سرخ فیتے کی اصطلاح کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ ضابطے کی کاروائی کے قواعد وضوابط سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں پر لاگو کیے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ثناء رؤف یوں رقمطراز ہیں:

> "Red tap as a broad term that can be defined as procedures and rules imposed on public and private-sector organization that result in negative impact."(4)

ترقی یافتہ ممالک میں یہ قواعد وضوابط انتظامی امور کے تکمیلی مراحل طے کرنے میں مؤثر ثابت ہو سکتا ہے لیکن ترقی پذیر ممالک جیسا کہ پاکستان میں کمزور پالیسیوں اور قوانین وضوابط مقاصد کے حصول میں ناکام ثابت ہوتے ہیں کیونکہ سرخ فیتہ کام میں تاخیر کا باعث بنتا ہے۔ کوئی کام بھی بروقت انجام پذیر نہیں ہو پاتا جس کی وجہ سے انتظامیہ میں بدعنوانی کے امکانات کی شرح میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس تاخیر اور التوا سے بچنے کے لیے سرکاری افسران کو رشوت دی جاتی ہے۔ اس نظریے کی توثیق میں ثناء رؤف مزید لکھتی ہیں:

"Red tape negatively impacts employee performance.when work tasks are delayed due to an excessiveness of unnecessary rules and regulations,it results in employee burnount,which eventually decreases their commitment to work."(5)

iii. فائلوں کے گورکھ دھندے

افسر شاہی کی تنقید کے حوالے سے ایک پہلو فائلوں کے انبار کی صورت میں سائل کی پریشانیوں کا باعث ہے جس کی طرف مقتدر طبقات قطع نظری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو سیاسی اور فوجی حکومتوں کے ادوار چڑھاؤ اور عدم استحکام کے مقابلے میں دفاتر میں فائلوں کا پھیلاؤ اور اس پھیلاؤ میں الجھا ہوا نظام بدستور مستحکم ہے۔بہت سے اہم معاملات صرف فائلوں کی صورت میں غیر ضروری قرار دے کر ان کو داخل دفتر کر دیا جاتا ہے۔تاہم ان میں بسا اوقات ایسی فائلیں بھی اپنا وجود کھو دیتی ہیں جن پر کوئی چھوٹی موٹی ہدایت جاری کی گئی ہوتی ہے۔یوں کہنا بجانہ ہو گا کہ ہم عہد حاضر میں بھی فائلوں کے متروک اور بوسیدہ نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے میں ناکام ہیں۔عمار چودھری اپنے ایک مضمون بعنوان ''ایک اور آتشزدگی، حکومت کو کیا کرنا چاہیے''جو کہ روزنامہ دنیا میں اشاعت پذیر ہے، میں رقمطراز ہیں:

> ''روایتی محکموں میں فائلیں افسروں کے تاخیری ہتھکنڈوں سے بچ جائیں تو آتشزدگی کی لپیٹ میں آجاتی ہیں۔آتشزدگی سے بچ جائیں تو ریکارڈ روم میں موجود چوہوں کا شکار بن جاتی ہیں۔''(۶)

فائلوں کے گورکھ دھندے نے پورے سماج کو عملاً مفلوج کر دیا ہے۔شاذ ہی کوئی کام فائلوں کی بھول بھلیوں میں گم ہوئے بنا قانون اور ضوابط کے مطابق انجام پذیر ہوا ہو۔پالیسیز کے نام پر متعدد کیسز فائلوں کے بوجھ تلے دب جاتے ہیں۔بعض اوقات تو سیاست، سرمایہ کاری اور افسر شاہی کے گٹھ جوڑ کی بنیاد پر مقتدر طبقات میں فائلوں کا ردوبدل کر کے ذاتی مفاد کا حصول ممکن بنایا جاتا ہے۔

ب۔ معاصر اردو ناول میں ان قباحتوں کی عکاسی کا مطالعہ

فن نے تہذیب کی گود میں آنکھ کھولی۔ تہذیب سے جنم لے کر جب پیرائیہ تحریر اختیار کیا تو ادب کی صورت میں اپنی پہچان بنائی۔ ادب علم و خیال کا ملاپ اور انسانی معاشرت کا دماغ تصور کیا جاتا ہے جو تحریری حوالوں کی مناسبت سے انسانی زیست کے ارتقائی مراحل، زندگی، اس کی ترقی کے مراحل، انسانی معاشرے اور تہذیب و تمدن کی تاریخ ہے۔ ادب کا دائرہ کار تمام شعبہ ہائے زندگی پر محیط ہے۔ ادب فن کا ایک ایسا شاہکار ہے جو ادبی حیثیت رکھتا ہے۔ بقول سید احتشام حسین: ''ادب مقصد نہیں، ذریعہ ہے، ساکن نہیں متحرک ہے، جامد نہیں تغیر پذیر ہے۔''(۷)

اسی خیال کی توضیح میں ڈاکٹر سید محمد عقیل یوں رقمطراز ہیں:

> ''ادب ہر زمانے میں زندہ رہتا ہے۔ وہ اپنے رخ تو بدلتا ہے مگر زندگی کے اصل دھارے سے الگ نہیں ہوتا، یہ دھارا انسانی زندگی اور سماج کے بیچ سے پھوٹتے ہیں۔ ادب زندگی کی دوڑ میں انسانوں کا آلہ کار بھی بنتا ہے اور ان کی جد و جہد کا گراف بھی۔''(۸)

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ابتدا سے ہی سماج میں تغیر و تبدل کا عنصر موجود ہے۔ ادب اپنے سماج کا عکاس ہوتا ہے۔ جس عہد کا جیسا سماج ہو گا ادب بھی اسی کے متشکل ہو گا۔ یہ بھی انسانی زیست کی طرح متحرک ہے اور ہمیشہ تبدیلی اس میں آتی رہتی ہے۔ اسی لیے ادب کا تغیر پذیر ہونا ایک لازمی امر ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے سید محمد عقیل کی کتاب ''نئی فکریں'' میں صفحہ نمبر ۴۰ پر درج رائے اہم ہے:

> ''عہد عتیق سے لے کر آج تک کے ادب پر جب ہم ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پتا چلتا ہے ہر دور میں انسان اور اس کی معاشرت، ماحول کے لحاظ سے اس کے ادب میں مختلف کروٹیں لیتی رہی ہے۔ کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب انسانی تاریخ، انسانی ادب پر اثر انداز نہ ہوئی ہو۔ کسی بھی زمانے کا ادب اس دور کے انسانوں کی تحریکات، خیالات اور نظریات کی عکاسی سے خالی نہیں رہا۔ انسان نے جب بھی اپنے خیالات کو رواج دینا چاہا۔ اپنی الجھنوں (چاہے وہ روحانی ہوں یا مادی) کا تذکرہ

کیا تو وہ ادب میں شامل کر لیا گیا، وہ دور جب انسان نے پڑھنا لکھنا سیکھا یا پھر وہ تصویری دور جب وہ اپنے جذبات و خیالات کی ترجمانی تصویریں بنا کر کیا کرتا تھا، اس وقت بھی ادب میں انسانی ضروریات، سماجی کشمکش اور اس کے جذبات کا اظہار ہوا کرتا تھا۔''(۹)

ادیب بھی اپنے سماج کا جیتا جاگتا فرد ہوتا ہے۔ وہ جس طرز کے سماج میں اپنی زندگی گزارتا ہے وہ اس سماج سے اسی نوعیت کے اثرات قبول کرتا ہے۔ نتیجتاً وہ اسی طرز کا ادب تخلیق کرتا ہے۔ درحقیقت ادب اور سماج ایک سکہ کے دو پہلوؤں کی مانند ہیں اور ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ جب بھی کبھی معاشرے میں برائیاں جنم لیتی ہیں اور معاشرت اپنا اخلاقی معیار کھو دیتی ہے تو اس عہد کا ادب سماج میں سر بلند کرنے والی برائیوں کو رفع کرنے میں معاون و ممد ثابت ہوتا ہے۔ زندگی کو مختلف الجہاتی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ انسانی زندگی کی تشکیل میں کئی عناصر کی کارفرمائی موجود ہے جو دو حصوں میں منقسم ہیں اولاً داخلی، انفرادی یا ذاتی نوعیت کے ہیں۔ ثانیاً خارجی اور اجتماعی نوعیت کے۔ موخر الذکر عناصر میں سماجی ماحول، انسانی گھریلو زندگی، ملکی نظم و نسق، سیاسی صورتحال، علاقائی اور ملکی جغرافیہ، ملک کے تاریخی عوامل اور سماجی رسم و رواج وغیرہ سب شامل تذکرہ ہیں۔ اب یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ادب کا دائرہ عمل انسانی زیست پر محیط ہے۔ ادب کی صنف ''ناول'' زندگی کا رزمیہ (Epic) بھی کہلاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کی وہ زندگی کی جدو جہد، اس کی کشمکشوں، پیچیدگیوں، ناکامیوں اور کامیابیوں کا آئینہ دار ہے۔ ناول کا براہ راست تعلق انسانی زندگی سے ہے۔ جس کی نوعیت خیالی یا تصوراتی نہیں بلکہ حقیقی، عملی اور حرکت ہے۔ H.G wells کے مطابق:

''ناول ایک ذریعہ ہے جس سے ہم دور حاضر کے اہم مسائل کو تنقیدی نگاہ سے دیکھ سکتے ہیں۔ ناول کے ذریعے اخلاقی اقدار، آدابِ رسوم و رواج، قوانین و ادارے، معاشرتی فکر، سیاسی، معاشرتی اور مذہبی مباحث کو جانچا جا سکتا ہے۔ یہ ایک طرح سے پورے دور کو آئینہ دکھاتا ہے۔''(۱۰)

ناول انسانی زندگی کی بازگشت، اپنے زمانے کا نقاد اور ترجمان تو ہے ہی لیکن جو بنیادی پہلو زیادہ اہمیت کا حامل ہے وہ ہے ناول نگار کا نقطہ نظر۔ تحقیق ہذا ''مقتدر سماجی طبقات کے استحصالی رویے: معاصر اردو ناول میں افسر شاہی کی قباحتوں کی عکاسی کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ'' اسی نقطہ نظر کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔ جس مطالعے کے

لیے تین ناولوں کو منتخب کیا گیا ہے۔یہ تین ناول محمد حفیظ خان کا ''کرک ناتھ'' (۲۰۲۰ء)، ''منتارا''(۲۰۲۱ء)اور خالد فتح محمد خان کا ''پری''(۲۰۰۶ء)ہیں۔تاہم یہ دیکھنا بھی مقصود ہے کہ جن امور کا ذکر ناولوں کے ضمن میں کیا گیا ہے ان تمام امور کو ناول نگار کس نظریہ سے پیش کر رہا ہے۔یہ پہلو نہایت اہمیت کا حامل ہے۔سید محمد عقیل اپنی کتاب ''جدید ناول کا فن''میں اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''یہ تمام چیزیں ناول نگار کے نظریہ حیات کے گرد گردش کرتی ہیں۔ان ہی کی بنیاد پر ناول نگار اپنی تخلیق کی عمارت تعمیر کرتا ہے۔اس لیے ادب کی ہر صنف کی طرح ناول بھی مصنف کے نقطہ نظر اور نظریہ حیات کی وضاحت ہے۔''(۱۱)

تخلیق اور تخلیقی صلاحیتوں کو ایک پیرایئے میں ڈھالنا ہر خاص وعام کے بس کی بات نہیں زورِ بازو یا طاقت کے بل بوتے پر تلوار تو چلائی جاسکتی ہے لیکن قلم کو چلانا ناممکنات میں شامل ہے۔قلم میں ایک طاقت ہے جس کے ذریعے نہ صرف سماج بلکہ سماج میں پائی جانے والی نسلوں کو راہِ مستقیم پر گامزن کیا جاسکتا ہے۔قلم میں ایک ایسی طاقت مضمر ہے کہ جس کی بدولت قوموں کی تقدیر کے فیصلے صادر کیے جاتے ہیں۔اسی کی وجہ سے انصاف کو معاشرے میں بامِ عروج تک پہنچایا جاسکتا ہے۔قلم کا اوجِ کمال صرف یہاں تک ہی محدود نہیں بلکہ جب یہی قلم کی طاقت کسی سپاہی کا ہتھیار بنتی ہے تو اس کی قوت و کمال دو آتشہ ہو جاتے ہیں۔ما قبل تشکیلِ پاکستان اور بعد میں پاک فوج سے وابستہ کئی ایک شخصیات (سپاہی سے لے کر جرنیل تک) نے قلم کا سہارا لے کر اپنے مقصدِ حیات کو پورا کر کے ناموری حاصل کی۔ایسی شخصیات نے ایٹموں کی دنیا اور میدانِ جنگ میں بہت سی آزمائشوں سے نبرد آزما ہونے کے باوجود قلم کی طاقت جیسی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی تخلیقی جہتوں کا لوہا منوایا۔کرنل (ر) عبدالرّحمٰن، ونگ کمانڈر (ر) مظفر علی سید، کرنل (ر) ضمیر جعفری، جنرل (ر) عبدالرّحمٰن، بریگیڈیئر (ر) گلزار، ونگ کمانڈر (ر) فہیم اعظمیٰ، بریگیڈیئر صدیق سالک، کیپٹن (ر) فیاض محمود سے لے کر تاحال ایک طویل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔میجر (ر) خالد فتح محمد بھی اسی طویل فہرست کا ایک حصہ ہیں۔بنیادی طور پر ان کا تعلق ادبی، فوجی اور علمی راجپوت گھرانے سے ہے۔مشرقی روایات کی پاسداری اور عظیم مملکت کی ترقی و منزلت کے دلدادہ اور خواہاں ہیں۔ان کے والد بزرگوار بھی برٹش انڈین آرمی میں کمشن حاصل کر چکے ہیں۔ان کے ایک بھائی جن کا اسمِ گرامی طارق یعقوب فتح محمد ہے۔پاک فوج سے ریٹائرڈ بریگیڈیئر ہیں۔ان کے ایک بھائی کا تعلق سیکرٹری الیکشن کمشن آف پاکستان

سے ہے۔ان کے ایک بھائی ڈاکٹر عامر علی حسین بھی ڈائریکٹر فارمکس پنجاب کے اعلیٰ عہدے پر فائز رہ کر اپنے فرائض منصبی انجام دے چکے ہیں۔آپ کی سکونت جے سنگھ ضلع گجرانوالہ میں ہے۔آپ کے اہلِ خانہ نے ماڑی بوچیاں ضلع گورداسپور سے ہجرت کر کے یہاں سکونت اختیار کی۔یوں آپ کا خاندان ایک علمی وادبی اور اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہے۔خالد فتح محمد ۱۹۶۹ء میں کمشن حاصل کر کے پاک آرمی کے ایک فعال رکن بنے۔یونٹ ۱۱ کیولری (ایف ایف) میں تقرری ہوئی،ٹروپ لیڈر،جی ایس او ۳،آپریشنز،سکوارڈن کمانڈر،ڈی کیو،سیکنڈ ان کمانڈ کے عہدوں پر فائز رہ کر ملک و قوم کی خدمت کی۔لاہور،گجرانوالہ،نوشہرہ،حیدر آباد اور کھاریاں میں تعینات رہے۔۱۹۷۱ء میں انہوں نے کچھ وقت مشرقی پاکستان میں گزارا۔زخمی ہونے کی وجہ سے واپسی اختیار کی اور گجرانوالہ میں دورانِ تعیناتی ۱۹۹۳ء میں قبل از وقت ریٹائرمنٹ حاصل کر لی۔ملازمت کی مصروفیات سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ناول نگاری کی طرف متوجہ ہوئے اور ہمہ گیر موضوعات پر قلم کے ذریعے اپنے جوہر دکھائے۔عالمی میعار کے حامل ناول اس صورت میں لکھے جا سکتے ہیں کہ جب گرد و نواح کے ماحول اور اس میں ہونے والی علمی وادبی سرگرمیوں پر طائرانہ نگاہ ڈالی جائے۔ان کی تحریریں دورِ حاضر کے مزدور طبقے کے مسائل،زندگی کی ناگفتہ بہ حالت اور عصر حاضر کے سماجی مسائل کے گرد گھومتی ہیں۔ان کے نزدیک ایک تخلیق کار یا قلم کار وائٹ کالر اشرافیہ کا لازمی جزو ہے۔ناول کی اس صدی میں پیش آنے والے عملی مسائل پر وہ گہرا مشاہدہ اور ادراک رکھتے ہیں جس کا ثبوت رواں صدی میں لکھے گئے ان کے ناول ہیں۔اظہر حسین اپنے ایک مضمون ''خالد فتح محمد کا فکشن'' میں اس نقطہ نظر کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ''ان کے محض فکشنی موضوعوں اور کرداروں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ الٹے ہاتھ چلنے والے لکھاری ہیں۔عام آدمی کے مسائل،عام آدمی کی کاوشیں،عام آدمی کی محبتیں،عام آدمی کی نفسیات،خاص آدمی کی درندہ صفتی،اس سے پھوٹنے والی ناانصافی اور سماج پر اس کے گھناؤنے اثرات وغیرہ ایسے ہی موضوعات ہیں جنہیں وہ اپنے ناولوں اور افسانوں میں دہراتے ہیں۔''(۱۲)

خالد فتح محمد نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار ادب کی صنفِ افسانہ سے کیا۔یوں افسانہ نگاری ان کے ناول نگار بننے کا نکتہ آغاز ہے۔ان کا پہلا افسانہ ''اماں نیلی'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔جس کی اشاعت ۲۰۰۰ء میں ہوئی۔۲۰۰۶ء میں ان کا پہلا ناول ''پری'' اشاعت پذیر ہوا۔ناول پری کو خالد فتح محمد کا افتتاحی ناول

بھی گردانا جاتا ہے۔ خالد فتح محمد نے اپنے تخلیقی فن میں پاکستانی معاشرے میں فرد اور قوم کی انفرادیت اور شناخت کی تگ و دو کے ساتھ ساتھ دورِ حاضر کی سماجی و سیاسی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات اور ان کے سماجی اثرات کی عکاسی عمدگی سے کی ہے۔

ناول 'پری' کا بنیادی کردار معظم علی خان، اس کے دفتر میں سیکرٹری کے عہدے پر فائز شفقت اور ناول کا مرکزی کردار زہرہ جبین معروف 'پری' زیرِ نظر ناول کی اساسی اکائیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ معظم علی خان ایک کامیاب صنعت کار ہے۔ ایک کامیاب کاروباری شخصیت اور طبقہ اشرافیہ کے دوسرے نمائندگان کی طرح اسے بھی اپنی جملہ کاروباری مصروفیات کی تھکن کو ہمہ دم رفع کرنے اور نئے سرے سے ذہنی آسودگی حاصل کرنے کے لیے کسی پری کی ضرورت پڑتی ہے۔ اپنی جمالیاتی حس کی تمناؤں اور ازدواجی زندگی کی ناکامی کے باعث اپنی زندگی کے انتہائی اہم فیصلے کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ اپنی عمر کے حساب سے انچاس کے پیٹے میں قدم رکھ چکا ہے لیکن اپنی باطنی کیفیات کی بدولت وہ ایک شوخ نوجوان کی طرح رقابت، تشکیک، حسد اور جلن جیسی اضطرابی کیفیات سے دوچار رہتا ہے۔ یہی کامیاب صنعت کار پری کی وساطت سے عبدالمجید جیسے سیاستدان سے واقفیت حاصل کرتا ہے جس کی بدولت معظم علی خان بھی سیاسی زندگی کے اسرار و رموز سے آشنا ہوتا ہے کہ بدقسمتی سے ہمارا سیاسی اور انتظامی نظام تشکیلِ پاکستان کے دور سے اپنے قدم مضبوطی سے نہ جما سکا۔ اسی سیاسی زندگی کی بے ہنگم رفتار کی بدولت حکومت و اقتدار میں مارشل لاء کا نفاذ ہوتا رہا۔ جس میں سول اور فوجی بیوروکریسی کا عمل دخل بھی روزِ اوّل سے تھا۔ اپنی سیاسی تبدیلیوں اور عدم استحکام کی بدولت افسر شاہی اور دیگر متعلقہ شعبوں میں بدعنوانیوں نے اپنے قدم جما لیے اور آمریت، اقتدار اور جبر و استبداد کا کھیل مختلف شکلوں اور کرداروں کی وساطت سے ماضی سے تاحال کھیلا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر تحسین بی بی ناول اور ان بدعنوانیوں کے حوالے سے اپنے ایک مضمون مشمولہ سہ ماہی ادبیات میں لکھتی ہیں:

> ''اردو ناول میں سیاست اور سیاست دانوں کی غلطیوں، بدعنوانیوں کے خلاف نفرت کا اظہار کئی ناول نگاروں کے ہاں بالکل واضح نظر آتا ہے کیونکہ ادیب اپنے عہد کے لیے لکھتا ہے اور یہ اس کا اپنے ہم عصروں سے خطاب ہوتا ہے اور وہ اپنا ایک سیاسی یا سماجی نقطہ نظر رکھتا ہے جس کا عکس اس کی تحریروں میں کہیں نہ کہیں ضرور نظر آتا ہے۔''(۱۳)

ہمارے سماج میں یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اکثر و بیشتر ملکی بلدیاتی نظام میں تبدیلیاں کی جاتی ہیں اور ان تبدیلیوں میں کئی افسروں کو ان پڑھ سیاسی لوگوں کے ماتحت کر دیا جاتا ہے مجموعی طور پر یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ ضلعی سطح پر ایک افسر اعلیٰ یعنی ڈپٹی کمشنر ایک واجبی سی تعلیم رکھنے والے ضلعی ناظم کے ماتحت کر دیا جاتا ہے اور وہ ضلعی ناظم ان کو اپنے مذموم سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتا ہے۔یوں ہماری افسر شاہی کی کئی قباحتیں ہمارے سیاسی نظام کی پیداوار ہیں۔اس قسم کی قباحتوں کی عکاسی اکیسویں صدی کے ناولوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔چونکہ ناول سماج کا آئینہ دار ہے لہذا اس طرح کے موضوعات کا بیانیہ ایک فطری عمل ہے۔اگر ہم حالیہ برسوں میں شائع ہونے والے ناولوں پر نظر ثانی کریں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہ ناول نئے سماجی موضوعات کی ترجمانی کرتے ہیں۔جن موضوعات کی بازگشت ہمارے معاصر ناولوں میں سنائی دی۔ان ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ ضروری ہے۔اس حوالے سے انیس اشفاق لکھتے ہیں: ''اچھا ہو گا کہ ان پر ایک نگاہ یہ جان لینے کے لیے ڈالی جائے کہ اس بازگشت کے پیدا ہونے کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما ہیں۔''(۱۴)

خالد فتح محمد نے ناول 'پری' میں اس بازگشت کے پیچھے کارفرما عوامل کی عکاسی بھرپور انداز میں کی ہے۔ناول کی فصل سوم میں پاکستان کے سیاسی منظر نامے اور اس سے جڑے کئی دوسرے نظاموں کی عکاسی کی ہے ناول میں ماضی کی بازگشت بھی ہے اور حال کا بیانیہ بھی۔ معظم علی خان جب ایک کامیاب صنعت کار ہونے کے بعد سیاسی و کاروباری وابستگیوں اور اپنے بل بوتے پر اپنے عشق کی وساطت سے ملک کی ایک نامور سیاسی شخصیت کے طور سامنے آتا ہے تو معاشرے کے مروجہ سیاسی نظام اور افسر شاہی کی اصل حقیقتیں اس پر آشکارہ ہوتی ہیں۔افسروں کا ان پڑھ سیاسی لوگوں کے ماتحت ہونا ناول نگار کے مطابق کچھ اس طرح سے بیان کیا جاتا ہے:

> ''سیاسی حالات عبدالمجید کے تجزیے کے عین مطابق تھے۔پارلیمانی نظام حکومت کو ختم کر کے ملک صدارتی طریقے سے چلایا جا رہا تھا۔صدر کی اعانت کے لیے کابینہ موجود تھی مگر ان کے پاس اختیارات قطعاً نہیں تھے۔بیوروکریٹس کا پرانا ٹولہ طاقت کا بروکر بنا ہوا تھا۔ان کو مزید طاقت کا سہارا لینے کے لیے چند وزراء بین الاقوامی اداروں سے درآمد کر لیے گئے۔ان کی سوچ قطعاً پاکستانی نہیں تھی۔صدر بھی پاکستان کے معاشی حالات سے ناواقف تھے۔وہ صرف جغرافیائی سیاست پر

مبنی بین الاقوامی حالات سے واقف تھے۔ یہ واقفیت انہیں ملکی سرحدوں کے پار سیاسی، سماجی اور معاشی حالات پر کافی حد تک دسترس مہیا کرتی لیکن ملکی حقائق جاننے کے لیے انہیں چیدہ چیدہ بیوروکریٹوں کا مرہونِ منت ہونا پڑا جن کے اپنے عزائم تھے۔"(۱۵)

ملکی سیاست کے بحران کا تذکرہ کیا جائے تو افسر شاہی، سیاستدانوں اور ان کے کردار کا ذکر بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں سیاستدانوں کی اکثریت کا تعلق کم تعلیم یافتہ طبقات سے ہے جن کی سیاسی قوت جاگیرداری، صنعت کاری اور دیگر ذرائع سے حاصل ہونے والی دولت اور اثر ورسوخ کی مرہونِ منت ہے۔ یہ بھی ایک ناقابلِ مسترد حقیقت ہے کہ ہماری اعلیٰ سیاسی قیادت جمہوریت کی پیداوار نہیں بلکہ یہ کسی نہ کسی سہارے کے بل بوتے پر پروان چڑھی ہے۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو کونسلر کے انتخابات تک میں کامیابی حاصل کر کے نہیں آئے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سیاسی قیادت ملک و قوم کی خدمت کے جذبے سے عاری ہے۔ نتیجے کے طور پر افسر شاہی، جس کی اساسی نوعیت ایک خدمت گار کی ہے، اس میں بھی سیاستدانوں کے زیرِ سایہ رہ کر یہی رجحان پروان چڑھا ہے۔ اسی وجہ سے دونوں طبقات احساسِ تفاخر اور برتری کا شکار ہیں اور ان کے رویے میں تکبر اور نخوت در آئی ہے جو کہ سماج میں مزید بگاڑ کا باعث ہے۔ دونوں طبقات کے باہمی گٹھ جوڑ کی وجہ سے ملک میں انتظامی امور سست روی کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ یقیناً اس کی کچھ وجوہ بھی ہوں گی۔ تاہم لگتا یوں ہے قطرے کے گہر ہونے تک بہت سی منازل ابھی طے کرنا باقی ہیں۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ وہ لوگ جنہیں اللہ نے بہترین ذہنی صلاحیتوں اور ملکی تعمیر کے جذبے سے نواز رکھا ہے وہ ان کے ماتحت کام کر رہے ہیں اور یہی سیاسی لوگ ہر بار کرسیِ اقتدار پر متمکن دکھائی دیتے ہیں۔ ہماری سیاست کا محور جہالت سے عبارت دکھائی دیتا ہے۔ یہی امر ہماری افسر شاہی اور سیاسی نظام کی کمزوری کی دلیل ہے۔ عصری صورتحال کو پیش کرنا ناول کا ایک فریضہ ہے۔ جب بھی کسی ناول نگار کو کوئی معاصر مسئلہ چمکتا نظر آتا ہے تو وہ ناول کی صنف کو سر آنکوں پر بٹھا لیتے ہیں۔ ناول نگار اپنے ہم عصر معاشرے کا نمائندہ ہوتا ہے اور اس کی بدولت وہ اپنے معاصر سماج کو ناول میں تفصیل اور وضاحت سے پیش بھی کرتا ہے۔ اسی نقطہ نظر کی عکاسی ناول 'پری' میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ پاکستانی مملکت آغاز ہی سے ذاتی مفادات کو قومی مفادات پر ترجیح دینے والے سیاستدانوں کے زیرِ تسلط رہی۔ عوام پر ہمیشہ ایسے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے اپنی حکومت قائم کی جو کہ قائدانہ صلاحیتوں

اور سیاسی بصیرت سے ناآشنا تھے۔ تو کیا ایسے لوگ آغاز ہی سے پاکستانی عوام پر مسلط کیے جاتے رہے جن کے ماتحت افسر شاہی کام کرتی رہی۔ ایسے افراد اپنی ذات میں خود غرض ہونے کے ساتھ ساتھ نااہل بھی ہیں۔ ہماری افسر شاہی نااہل سیاسی قیادت کا ان کے مذموم مقاصد کے حصول میں ان کا ساتھ دیتی رہی۔ ایک اعلیٰ افسر قوانین وضوابط کی کتابوں کا پابند ہوتا ہے جبکہ اس کے برعکس ایک سیاسی شخصیت ان تمام پابندیوں سے ماوراء ہو کر اپنے ووٹروں کی خوشحالی پیدا کرنے والے ضابطوں میں سرگرداں رہتے ہیں۔ یہیں سے اختلاف جنم لیتے ہیں۔ ایک سرکاری افسر قوانین وضوابط کے باوجود ان سیاسی کارکنوں کے آگے خود کو ہارتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس تمام منظر نامے کی عکاسی زیرِ نظر ناول میں بھی کی گئی ہے۔ معظم علی خان جو کہ صرف ایک کامیاب صنعت کار تھا۔ سیاست میں موجود حکومت کے صدر نے اسے بہت سے نئے عہدے تفویض کر دیے اور کئی سرکاری محکموں کو اس کا ماتحت بنا دیا۔ وضاحت کے لیے ناول کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''صدر نے ایک دن حکومت برخواست کر کے نئی صدارتی کابینہ تشکیل دی اور ان تمام عوامل کی قانونی حیثیت رکھنے کے لیے اسمبلی نہیں توڑی بلکہ اجلاس کی تاریخ بھی دے دی۔ مجھے وزارتِ داخلہ کی ٹاسک فورس کا سربراہ بنا دیا گیا۔ پاسپورٹ کے علاوہ ایف آئی اے، پولیس اور دیگر کئی محکمے میرے ماتحت ہو گئے۔ میں اپنا فیصلہ کر چکا تھا اور اس پر عمل درآمد کے لیے مجھے فوری فوائد حاصل ہوئے تھے۔''(۱۶)

خالد فتح محمد بڑی چابکدستی کے ساتھ اپنے قارئین کے روبرو کہانی کے تانے بانے کے مطابق کردار، مکالموں، مناظر اور دیگر فنی لوازمات کی مدد سے معاشرے میں موجود مسائل کو پیش کرتے ہیں۔ ناول میں بھی معظم علی خان، پری، عبدالمجید، غفور اور دیگر ضمنی کرداروں کی بدولت سیاسی نظام اور افسر شاہی سے متعلقہ مسائل کو آشکار کیا ہے۔ پلاٹ کے تمام واقعات ایک دوسرے سے باہم مربوط نظر آتے ہیں جس سے ناول نگار کا نقطہ نظر واضح ہو جاتا ہے۔ کہانی میں کہیں بھی جھول محسوس نہیں ہوتا۔ ناول نگاری کی اس خصوصیت کے بارے میں سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

> ''جس طرح شاعر کوئی نظم کہنے سے پہلے اپنے ذہن میں اپنے افکار و تصورات کو منطقی طور پر ترتیب دیتا ہے۔۔۔ اسی طرح ایک ناول نگار بھی اپنی کہانی کے تمام

بنیادی عناصر کو لے کر ان کا ایک منطقی سلسلہ قائم کرتا ہے۔واقعات باہم اس طرح مربوط ہو جاتے ہیں کہ ایک واقعہ دوسرے واقعے سے ابھرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔کہیں علت و معلول کی صورت پیدا ہوتی ہے کہیں کسی لزوم کی، لیکن بہرحال کہانی کے واقعات مربوط ہو کر افکار کے اس سلسلے کا روپ دھارتے ہیں۔''(۱۷)

واقعات کی ایسی ہی مربوط صورت زیرِ جائزہ ناول میں بھی موجود ہے۔ناول کے تمام بیان کردہ واقعات سے ایک نئے واقعے کا آغاز ہوتا ہے۔جس سے ہمارے سماج میں موجود سیاسی زندگی اور افسر شاہی سے متعلقہ تمام ہتھکنڈوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ناول 'پری' کا ایک بنیادی پہلو پاکستانی سیاست اور پاکستان میں موجود سیاستدانوں کی نااہلی اور ایک نئے سیاسی نظام کی ضرورت ہے۔انہی حوالوں سے کہانی مختلف واقعات کی شکل میں آگے بڑھتی ہے۔ناول میں سیاستدانوں کو ملکی نظام چلانے کے لیے ہمیشہ ایک رفیق کار کی ضرورت رہی۔کیونکہ نااہل سیاستدان کسی بھی قسم کے حالات سے نبرد آزما ہونے کے قابل نہ تھے۔سیاسی جماعتوں نے سیاسی میدان میں اپنے قدم مضبوط کرنے کے لیے ووٹ کی طاقت کے پیچھے کارفرما ایک اور قوت کا سہارا لیا اور اس طرح سیاست اور مافیا کے مابین مجرمانہ مفاہمت ہونے لگی۔خالد فتح محمد خان نے سیاست دانوں کی نااہلی اور کمزوری کو معظم علی خان کی زبانی کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے:

''جو لوگ سیاست میں میرے رفیق تھے میں اکثر ان کے تعقل پر حیران ہوتا۔نہ وہ کسی قومی یا بین الاقوامی سیاسی مسئلے کو صحیح تناظر میں دیکھ سکتے تھے اور نہ ہی ان میں اس کا تنقیدی تجزیہ کرنے کی اہلیت تھی۔''(۱۸)

اس قسم کے معاشرے میں افسران پڑھ سیاستدانوں کے ماتحت کام کرتے نظر آتے ہیں جن کے اپنے ذاتی مفاد ہوتے ہیں۔برسرِ اقتدار آنے والی ہر سیاسی جماعت سرکاری محکموں کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے اور اپنی حریف جماعتوں کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہے۔یوں سماج میں بدعنوانی کا آغاز ہوتا ہے۔قانون کی بالادستی کی راہ میں رکاوٹیں سیاستدان ہی ڈالتے ہیں۔انہوں نے قوانین اور قاعدوں کی بھی پاسداری نہ کی۔اس کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان کے عزیز و اقارب مختلف مراعات حاصل کر سکیں جس کے وہ کسی صورت بھی اہل نہ تھے۔ان عملی اقدامات کے سبب انتظامیہ کے افسران کی حوصلہ شکنی کی گئی اور ان کے

اعتماد کو ٹھیس پہنچی یعنی جس سماج میں افسروں کو ان پڑھ سیاسی لوگوں کے ماتحت بنا دیا جاتا ہے وہاں قانون کی بالادستی ذاتی مفاد کی نظر ہو جاتی ہے۔ یہ امر افسروں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ اگر انہوں نے قوانین و ضوابط کو پسِ پشت ڈال کر سیاستدانوں کے مفادات کے لیے ہی کام کرنا ہے تو پھر وہ اپنے ذاتی مفاد کو کیوں نہ ترجیح دیں۔ اگر وزیر یا حکمران خود ہی بدعنوان ہو جائے تو ردِ عمل کے نتیجے میں ماتحت افسر بھی ان کی تقلید کرتا ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ خدشہ اس بات کا ہے کہ یہ وزیر ان حکمرانوں کا احتساب خود بدعنوانی کا مرتکب ہونے کی وجہ سے نہیں کر پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے افسران کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے مکمل طور پر ان کا ساتھ دیا جاتا ہے۔ یوں بدعنوانی مختلف صورتوں میں پورے سماج میں سرایت کر جاتی ہے۔ ان تمام حالات کی تصویر کشی ناول میں موجود ہے حالانکہ خالد فتح محمد کی ناول نگاری کا آغاز اکیسویں صدی کی پہلی دہائی سے ہوا اور وہ اپنے ناولوں میں فرضی کرداروں کی بدولت مذکورہ حالات پر عوام سے مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ پاکستانی عوام کو سیاسی، اقتصادی اور سماجی عفریت سے آزاد کروا کر ان کے لیے خوشیاں کشید کرنے کے متمنی ہیں۔ ایک ایسا سماج جو جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور دیگر مقتدر طبقات کے ہاتھوں اپنی خود مختاری اور آزادی گروی رکھ چکا ہو تو ادیب اسے اپنی آزادی کا احساس دلاتا ہے۔ یہی اکیسویں صدی کا ادیب کر رہا ہے۔ خالد فتح محمد بھی اسی کارواں کے راہی ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں کی بدولت جرات کے ساتھ حق اور صداقت کا ساتھ دیا ہے۔ ان کا زیرِ جائزہ ناول ان کی اس سوچ کا گواہ ہے۔ ڈاکٹر طاہرہ سرور خالد فتح محمد کی ناول نگاری کے ضمن میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''خالد فتح محمد نے اپنے ناولوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔ ان کا مشاہدہ وسیع اور تجزیہ ہمہ گیر ہے۔ اسلوب کے حوالے سے بھی خالد فتح محمد کے ناول انفرادیت کے حامل ہیں۔ وہ بڑے سادہ انداز میں کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں اور واقعات کو آپس میں مربوط رکھتے ہیں۔''(۱۹)

رواں صدی کے ابتدائی عشرے کی ناول کی تخلیقات کو مدِ نظر رکھ کر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ صدی ناول کی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس میں ہر طرح کے مسائل اور موضوعات پر ناول تحریر کیے گئے اور اس کا سلسلہ ابھی بھی جاری و ساری ہے۔ اس عہد میں بھی ایسے ناول لکھے گئے جن میں زیست کے مسائل کی عکاسی بھی ہے، سیاسی ریشہ دوانیاں بھی ہیں، قدروں کی زوال پذیری بھی ہے، بدعنوانی، چوری، لوٹ

کھسوٹ، کرپشن، طبقاتی کشمکش کے علاوہ اور بھی متعدد موضوعات ہیں جو کہ اس صدی کے ناولوں میں موجود ہیں۔ مذکورہ تمام موضوعات کی پیش کش میں تخلیق کار کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ جہاں تک خالد فتح محمد کے ناول 'پری' کا ذکر ہے تو اس میں ملٹری اور سول بیوروکریسی کی ظلم و زیادتی، سماجی صورتحال اور افسران کی زندگی کا نقشہ کرداروں کی مناسبت سے اچھی طرح پیش کیا ہے۔ ناول میں سیاسی نظام میں بیوروکریسی کی ضرورت کو کلیدی حیثیت دی گئی ہے۔ ناول میں خالد فتح محمد خان نے سیاسی نظام کے لیے بیوروکریسی کے عمل دخل کو ناگزیر قرار دیا ہے۔ اس میں سول اور فوجی دونوں طرح کی بیوروکریسی شامل ہے۔ اس کا تذکرہ کرداروں کی مناسبت سے اس طرح پیش کیا ہے:

''معاونین، وزیر یا آپ انہیں کوئی بھی نام دے سکتے ہیں صرف سربراہ کو جواب دہ ہیں۔ وہ پارٹی لائین یا کسی بادشاہ گر کے محتاج نہیں، ان کی کارکردگی کا وہ ذمہ دار ہے اور کسی بھی معاون کی نااہلی اس کے اپنے اخراج کا باعث بن سکتی ہے۔''

''بیوروکریسی؟''

''کون سی سویلین یا فوجی؟''

معظم نے غفور کی چاہے کی تازہ پیالی بنانے کا انتظار کیا۔

''دونوں''

''سویلین بیوروکریسی صرف عمل درآمد کے لیے ہو گی اور وہ کسی طور مشاورتی عمل میں نہیں لائے جائیں گے۔''(۲۰)

سول اور ملٹری بیوروکریسی سیاسی عمل کے لیے ناگزیر قرار دی گئی۔ نوآبادیاتی عہد میں بھی سرمایہ داروں اور سیاستدانوں کے گٹھ جوڑ کا اہم عنصر سول اور ملٹری بیوروکریسی ہی رہی۔ اس دور کی بیوروکریسی کی تربیت برطانوی سامراج کی روایات کے تحت ہوئی۔ سرمایہ دار، جاگیردار، سول اور ملٹری بیوروکریسی کی معاونت کے بغیر اپنا سیاسی تسلط برقرار نہیں رکھ سکتے تھے۔ یہ باہمی گٹھ جوڑ ایک منظم منصوبہ بندی کے تحت کیا گیا تاکہ پورے ملک پر سیاسی آمریت کو قائم رکھا جا سکے۔ مابعد نوآبادیاتی عہد کا ملکی نظم و نسق اس بات کا متقاضی تھا کہ نوآبادیاتی سیاسی ڈھانچہ تبدیل کیا جاتا لیکن نوآبادیاتی باقیات ہنوز بامِ عروج پر تھیں اور سیاسی عمل میں

ار تقاء ہونے کی وجہ سے سول اور ملٹری بیوروکریسی کو مزید استحکام ملا۔اسی قسم کی صورتحال کو خالد فتح محمد نے زیرِ جائزہ ناول میں فرضی کرداروں کی صورت میں پیش کیا ہے۔جب عبدالمجید نئے سیاسی عمل کے آغاز اور ترویج کا لائحہ عمل اختیار کر رہا تھا تو یہی روایات اس کے مدِ نظر تھیں جس سے مابعد نوآبادیاتی عہد میں بھی نوآبادیاتی سوچ اور رویہ ہے۔جس کی وجہ سے آزادی کے ثمرات تک عام آدمی کی رسائی ممکن نہ ہو سکی۔مثال کے لیے مذکورہ ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''لیکن آپ اہم نظریے کی نفی کر رہے ہیں۔یہ غیر سیاسی عمل ہے کیونکہ اس کے ذریعے صرف بیوروکریٹ ہی سربراہ ہوں گے۔آپ ایک طرح سے شخصی حکومت کو پروان چڑھا رہے ہیں جو جمہوریت کی بجائے آمریت کے قریب ہے۔''(۲۱)

درج بالا اقتباس میں بیوروکریسی کی شخصی آمریت کو دو الگ تناظر میں دیکھا گیا ہے۔پہلا یہ کہ اس قسم کے نظریے جمہوری عمل کے منافی ہوتے ہیں اور دوسرا ایک شخصی آمریت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔سیاسی جماعتیں سیاسی میدان میں اپنے قدم جمانے کے لیے ووٹ کی طاقت کے ساتھ ساتھ ایک مخفی قوت کا سہارا لیتی ہیں۔سیاسی عدم استحکام کی بدولت بیوروکریسی کی بالادستی قائم ہو گئی۔اس طرح انتظامیہ خود مختار اور احتسابی عمل سے ماوراء ہو گئی۔اس سلسلہ عمل کے ردِ عمل کے طور پر بہت سے دیگر نوعیت کے مسائل نے جنم لیا۔عبدالمجید کے اس نظریے کے مطابق شخصی آمریت کو پروان چڑھایا جا رہا تھا جو کہ جمہوری اصولوں کے یکسر منافی ہے۔مذکورہ بالا صورتحال کے اسباب و وجوہات کو محمد علی خالد کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''آج چالیس سال سے زائد عرصے میں سول اور ملٹری بیوروکریسی نے پورے شکنجے معاشرے میں گاڑے ہوئے ہیں اور انہوں نے شخصی اقتدار کو استحکام بخشا ہے۔شخصی آمریت کو مضبوط کرنے میں بیوروکریسی کا اہم کردار ہے۔''(۲۲)

اکیسویں صدی کے آتے ہی بیوروکریسی سے متعلقہ کئی مسائل منظرِ عام پر آئے۔ان مسائل کو سامنے لانے کا مقصد مسائل شماری نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے رواں صدی کے آخری ربع میں کس طرح بیوروکریسی کی بدولت جنم لینے والے مسائل سے ہمارا سابقہ ہو رہا ہے۔اگرچہ ان مسائل کی نوعیت خارجی ہے۔تاہم یہ ہماری نفسیات کا ایک جزو بنتے چلے جا رہے ہیں اور کیفیتی اعتبار سے یہ مسائل اس نوعیت کے ہیں جو

مجموعی طور پر ہمیں تنہائی، معدومیت، لایعنیت اور مہملیت جیسی نفسیاتی حالتوں سے دو چار کرتے ہیں اور ذات کے اندر ہی سمٹنے پر مجبور کرتے ہیں۔اب مسائل کی وجہ سے ہم وجودی حالت کی نفی وانکار کے بجائے اس کے ثبات کی جنگ کرنے پر مجبور ہیں۔زیرِ جائزہ ناول میں اس کو بڑے انوکھے انداز میں پیش کیا گیا ہے اس میں بیوروکریسی کے المیے کو ایک نئے نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہے اور اس المیے کی مختلف صورتوں اور ان سے پیدا ہونے والے مختلف اثرات کی عکاسی کی گئی ہے۔اکیسویں صدی میں جو ناول تحریر کیے جارہے ہیں ان میں نہ صرف ملکی حالات کا کھل کر تذکرہ موجود ہے بلکہ بین الاقوامی مسائل بھی موضوع بحث ہیں۔اپنے جملہ محاسن کے اعتبار سے یہ ایک مضبوط ناول ہے۔اس ضمن میں مہ جبین اختر لکھتی ہیں:

> ''خالد فتح محمد کے ناول حقیقی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ان کی تحریروں میں ہمیں معاشرہ جیتا جاگتا اور سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔ان کے ناول معاشی، معاشرتی، سماجی، سیاسی، اقتصادی، عسکری اور ادیبانہ فکر کے عکاس ہیں۔''(۲۳)

آج کے دور میں ہم من حیث القوم بیوروکریسی کے حوالے سے جن مسائل سے دوچار ہیں خالد فتح محمد نے ان مسائل کے پسِ پردہ محرکات کچھ اس انداز سے ناول 'پری' میں قارئین کے سامنے پیش کیا ہے کہ وہ نہ صرف اس زبوں حالی اور اس ذمہ دار افراد کے متعلق آگاہی فراہم کرتے ہیں بلکہ ان جملہ مسائل سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی ایک آس اور امید بھی ان کے باطن میں سلگنے لگتی ہے۔یہی ایسی تحریک ہے جس کی بدولت قاری تگ ودو کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ناول میں ناول نگار نے ملکی اقتصادی حالت کی بھی عکاسی کی ہے جس میں جب ان پڑھ سیاسی لوگوں کے ماتحت افسرانِ بالا کو کیا جاتا ہے تو وہاں قومی مفاد کی بجائے انفرادی مفاد پرستی کو فوقیت ملتی ہے۔کچھ اس قسم کے محرکات کا ذکر خالد فتح محمد نے ناول میں کرداروں کی زبانی بیان کیے ہیں۔اس کی وضاحت کے لیے ناول کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''پہلے منتخب وزیرِ اعظم نے اقتدار سنبھالا تو اس کے پاس ملک کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے متعدد Options تھے۔بیوروکریسی کے تعاون سے اس نے ایسا حل نکالا جس نے معیشت کو ایسی دلدل میں دھکیل دیا جہاں سے ابھی تک نکلنا ممکن نہیں ہو سکا۔''(۲۴)

کئی ملکی سیاسی ادوار میں سیاسی قوتوں نے معیشت پر اپنا تسلط قائم رکھا یوں اقتصادیات پر مراعات یافتہ طبقے کے تسلط کو مزید استحکام ملا۔ تشکیلِ پاکستان سے لے کر تاحال اقتصادی پالیسیوں میں توازن کا فقدان تھا۔ یہ سب سیاسی ممبران کی اقتصادی امور سے ناواقفیت کا نتیجہ تھا۔ پورا معاشرہ انتشار اور افراتفری سے دوچار رہا۔ یوں معیشت کا یہ عمل عام آدمی کے مفاد میں تھا۔ مطلق العنان فوجی حکمرانوں۔ سرمایہ داروں، مفاد پرست سول و فوجی بیوروکریسی نے ۱۹۴۷ء سے عوام الناس پر اپنا تسلط قائم کر رکھا ہے۔ اب ایسا وقت آگیا ہے کہ شعبہ اقتصادیات بحران کا شکار ہے کیونکہ پالیسی سازاداروں پر سول و فوجی بیوروکریسی کا اقتدار تھا۔ سیاستدانوں کو عملاً مفلوج کر دیا گیا تھا۔ جمہوری ملکوں میں اقتصادی پالیسیاں اور ترجیحات پارلیمنٹ کے زیرِ سایہ تشکیل پاتی ہیں۔ جبکہ ہمارے ملک میں ملٹری و سول بیوروکریسی، صنعت کاروں اور جاگیرداروں کے باہمی گٹھ جوڑ کی بنا پر یہ عمل سرانجام دیا جاتا ہے۔ ایسی صورتحال میں مسائل کا جنم لینا ایک فطری عمل ہے۔ لیکن آمریت کے دورِ اقتدار میں تلخیاں اور نقصانات سنگین صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ناول میں خالد فتح محمد نے حکمرانوں کی اس پالیسی سازی کی تصویر کشی کی ہے:

> ''سوویت یونین بھی نیشنلائزیشن کی اندھی غار میں راستہ بھٹک گیا تھا۔ ہماری معیشت اس نوزائیدہ بچے کی طرح تھی جس کے پھیپھڑے خراب ہوں اور وہ آکسیجن Tent کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ قومیائے جانے کے اس عمل نے زندگی کا واحد سہارا یعنی بقا کا خیمہ اس کے اوپر سے اٹھالیا۔ جب صنعتوں کو قومی تحویل میں لیا گیا تو ملک کو فائدہ پہنچانے کے بجائے ان کے مالکوں کو نقصان پہنچانا مقصود تھا۔ جانتے ہیں کیا ہوا؟ معظم نے محسوس کیا عبدالمجید بعض جگہوں پر ہلکے مزاج کو کمرے کی کشیدگی میں کھول رہا ہے۔
>
> ''ان صنعتوں سے ملک کو فائدہ تو نہیں ہوا لیکن ان محکموں، جن کی تحویل میں وہ تھیں اور انہیں چلانے والے عملے کے وارے نیارے ہوگئے۔ جب یہ صنعتیں واپس مالکوں کو دی گئیں تو بجلی وغیرہ کے بل اور انکم ٹیکس تک ادا نہیں کئے گئے تھے۔ یہ تھی سزا صنعت کو قومیانے کی۔''(۲۵)

ناول کے مذکورہ بالا اقتباس کے مطابق بیوروکریسی کی معاونت سے سیاستدانوں نے پالیسی سازی کے ثمرات کو بیان کیا ہے۔ صنعتوں کو سرکاری تحویل میں دیے جانے کے بعد متعلقہ شعبوں کی ترقی کا کام نہیں کیا گیا۔ قومیائے ہوئی صنعتوں کو تبدیل کر کے دفترِ روزگار بنا دیا گیا۔ یہاں اس امر کا تذکرہ بھی بے جا نہ ہو گا کہ پاکستانی صنعتی ترقیاتی کارپوریشن پر بھی افسر شاہی کا تسلط رہا ہے جس کے روابط مستقل مفادات کی حامل صنعتی قوتوں اور گروپوں کے ساتھ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرکاری اداروں میں بدعنوانیاں قومی اقتصادیات پر منفی اثرات مرتب کر رہی ہیں۔ تجزیے کے مطابق قومی معیشت کو بدعنوان عناصر کنٹرول کر رہے ہیں۔ شخصی اور آمرانہ حکومتوں میں اسی نوعیت کے نتائج برآمد ہوتے ہیں کیونکہ آمرانہ نظام میں احتسابی عمل نہیں ہوتے اور پاکستان کی افسر شاہی اس عمل سے ماوراء ہے۔ ابتدا سے ہی افسر شاہی سیاسی اور پارلیمانی حکومتوں کو اپنے مفادات کے منافی گردانتی رہی جس کی بدولت آج ہمیں انتہائی پیچیدہ قسم کے سیاسی بحران کا سامنا ہے۔ آج کے دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ تمام قسم کے سیاسی بحران پر قابو پانے کے لیے انتظامی ڈھانچے اور افسر شاہی کی روایتی طاقت کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ فوجی اور سول بیوروکریسی نے آغاز سے اقتدار کے حصول کو مطمحِ نظر بنائے رکھا۔ فوجی اور سول افسر شاہی نے اقتدار کے بنیادی اداروں پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے سیاستدانوں کو عملاً مفلوج کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ فوجی اور سول بیوروکریسی کے مفادات یکساں نوعیت کے حامل تھے۔ دونوں طبقات کو اپنی طاقت کا بھرپور احساس تھا۔ آج بھی پاکستانی معاشرے کو انہی قسم کے حالات کا سامنا ہے جس کی عکاسی اکیسویں صدی کے ادب میں بھرپور کی گئی ہے عہدِ رفتہ و گزشتہ کی تاریخ ترتیب دینے والوں کی یہی عرق ریزی انہیں معاشرے میں منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ قاری کو صرف لفظوں کے پیچ و خم مکالمہ نگاری کے ذائقے ہی درکار نہیں وہ جیتا جاگتا معاشرہ بھی چاہیے جہاں پر واقعات وقوع پذیر ہوئے ہوں۔ خالد فتح محمد کا یہی احساس انہیں اپنے بنیادی مقصد سے دور جانے نہیں دیتا اور وہ اپنے دائرہ میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ ناول 'پری' میں تاریخ کے واقعات سے منتخب کردہ وہ واقعات ہیں جو حیرت و استعجاب کے ساتھ ایک نئی دنیا سے روشناس کراتے ہیں۔ انہوں نے ناول میں ایک کہانی کی طرح ان تمام واقعات کو بیان کیا ہے کہ جس سے قاری خود کو اس دور میں موجود پاتا ہے۔ ناول کا درج ذیل اقتباس اس نقطہ نظر کا بھرپور عکاس ہے:

> ''جب ملک بنا یہاں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو سوائے اپنے حصے کے کچھ نہیں چاہتے تھے اور دوسرے جو ہر ایک کے حصے پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ ایک

ایسی جنگ تھی جس میں بیوروکریسی نے بڑھ چڑھ کا حصہ لیا۔انہوں نے غلط کو غلط نہیں بلکہ صحیح کہا۔یہیں سے ملک بھول بھلیوں میں گم ہو کے کمزور اور جانبدار گورنس کی نظر ہو گیا۔سیاست دان ابھی اتنے اہل نہیں ہوئے تھے کہ وہ اس لاوے کے بھاؤ کو روک سکتے۔ان کی ناتجربہ کاری کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے کمانڈر ان چیف کو وزیرِ دفاع بنا کے ملک کے سیاسی ارتقاء کو روک دیا۔بعد میں اس کے پسندیدہ بیوروکریٹس سے چند ایک منفرد کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ان میں سیاسی جماعتوں کا قلع قمع اور طبقاتی خلیج کو مزید وسیع کرنا تھا،ہم اور آپ اس کی پیداوار ہیں۔''(۲۶)

شخصیت پرستی کے رجحان کی بدولت سیاسی عمل کی ترویج میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ملکی سیاسی جماعتیں روزِ اوّل سے ہی شخصیتوں کے گرد گھومتی رہیں۔سول و ملٹری بیوروکریسی بھی اسی بات کی متمنی تھی کہ ملک میں سیاسی جماعتیں استحکام حاصل نہ کر سکیں کیونکہ شخصیتوں کو طبعی اور سیاسی طور پر منعدم کرنا ان کے لیے کوئی مشکل بات نہ تھی۔بصورتِ دیگر سیاسی جماعتوں کے استحکام، کی وجہ انہیں کمزور کرنا مشکل تھا۔سول اور ملٹری بیوروکریسی ایک ایسا کمزور سیاسی نظام چاہتی تھیں کہ جس کی باگ خود ان کے ہاتھ میں ہو۔یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ فوجی اور سول سروس نے عملی طور پر پورے حکومتی نظام پر اپنا قبضہ جمار کھا ہے۔اس تمام المیے کی تصویر کشی زیرِ نظر ناول میں بخوبی کی گئی ہے۔یہاں لکھنے والوں کے تخلیقی افکار سماجی اقدار سے متاثر نظر آتے ہیں۔سیاسی میدان میں قدم جمانے اور سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے کس طرح کی چالاکیوں اور عیاریوں سے کام لیا جاتا ہے اور کیسی کیسی سازشیں ہوتی ہیں اس کا پورا منظر ناول 'پری' میں موجود ہے۔خالد فتح محمد ملکی سیاست کے پس منظر میں نئے سیاسی منظر نامے کا اور اس منظر نامے کی سیاست کی کارفرمائی میں معاون منفی عناصر کا تفصیلی تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ان تمام مباحث کے توجہ طلب ہونے کے باوجود اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عصرِ حاضر میں ادب کے ہمہ گیر افکار کی روشنی میں ہماری قدیم بصیرتوں سے جو بصیرت کشید کی گئی ہے وہ بامعنی ہونے جا رہی ہے۔ناول 'پری' بھی اس بصیرت کا آئینہ دار ہے۔

جہاں تک افسر شاہی نظام کی سست روی کا تعلق ہے تو اس کا منبع سرکاری دفاتر میں رائج سرخ فیتے کا نظام ہے۔پاکستانی عوام کو سرکاری دفاتر میں سرخ فیتے اور فائلوں پر مبنی مروجہ نظام کی شکایت تو روزِ اوّل سے ہی رہی

لیکن گزشتہ بیس سالوں کے دوران یہ سرخ فیتہ جبر واستحصال کے فیتے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔پولیس،انتظامیہ کے علاوہ کئی دیگر ادارے اس قسم کے روایتی نظام کی بدولت عوام کے لیے پریشان کن حالات کا منبع ثابت ہو رہے ہیں۔ان سے چھٹکارا حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔پورے سماج پر بے یقینی اور مایوسی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔اس مروجہ دفتری نظام اور سرکاری اداروں کی اس روایتی ثقافت سے بغیر کسی مضبوط ارادے اور منظم اقدامات تبدیلی ناممکن ہے۔فائلوں کے اس نظام کی پیچیدگی سے کچھ مفاد پرست عناصر قدم قدم پر لوگوں کا استحصال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے حقائق ہمیں ناولوں میں بھی ملتے ہیں۔اردو ناول ملک کی معاشرتی سیاسی، معاشی اور ثقافتی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ناول نگار بحیثیت تخلیق کار انسانی زندگی کو بطور تخلیق پیش کرنے کی تگ ودو کرتا ہے۔لہذا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رواں صدی کے آغاز ہی سے ناول نگار بھی برق رفتاری سے تبدیل ہوتی سماجی، ثقافتی، سیاسی اور جغرافیائی صورتِ حال میں انسانی زیست اور انسانی وجود کی معنویت کا تعین کرنے میں مصروفِ عمل ہیں۔اکیسویں صدی کے ناول نگاروں کی تخلیقی صلاحیتیں اردو ناولوں میں کئی دنیائیں پیدا کر رہی ہیں۔ان ناول نگاروں نے روایتی نظریاتی جکڑ بندیوں سے خود کو ماوراء رکھا ہے۔وہ ہمارے سماج سے بامعنی مکالماتی انداز اختیار کرتے نظر آتے ہیں اور انسانی وجود میں نئی راہوں کا کھوج لگانے میں مصروف ہیں۔محمد حفیظ خان نے سیاسی اور انتظامی شعور سے مزین ناول ''نتارا'' میں سیاسی و معاشرتی اور انتظامی پہلوؤں اور اس میں موجود سازش اور مختلف قسم کی ریشہ دوانیوں کی بھرپور عکاسی کی ہے جس میں انہوں نے اپنے عصرِ حاضر کی افسر شاہی نظام کی قباحتوں کو استعاراتی انداز میں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی استحصال کو موضوع بحث بنایا ہے اور افسر شاہی نظام کی کج رویوں کے سماج پر منفی اثرات کو واضح کیا ہے۔ملکی سیاسی نظام کو ایک نئے رخ میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ افسر شاہی نظام میں سست روی اور سرخ فیتے کے نظام کو استعاراتی انداز میں قلم زن کیا ہے۔ناول کا مرکزی کردار مخدوم ناظر حیات جو کہ سینٹ آف پاکستان کا ایک رکن ہے۔اپنی عمر کے ساٹھ سے ستر سال وہ خوبصورت اور حسین عورتوں کے جلو میں گزار چکا ہے۔وہ اپنی زندگی کے باقی ماندہ حصوں میں عہدِ جوانی کی یادوں کو پھر سے تازہ کرتے کے لیے بحرِ ہند کے ساحلوں کا رخ کرتا ہے۔قاری سے مخدوم ناظر حیات کی ملاقات انہیں ساحلوں پر ہوتی ہے۔جب وہ اپنی آخری حسین دوست نائلہ کے ہمراہ کولمبو کے ساحلوں میں لطف کشید کر رہا ہوتا ہے۔محمد حفیظ خان نے کہانی کو نہایت عمدہ انداز میں آگے بڑھایا ہے۔اس ناول میں کہانی کے تار و پود میں مجموعی طور پر معنویت کی سطح پر انتظامی، سیاسی، سماجی، عالمی اور قومی حوالوں سے کئی تعبیریں ممکنات

میں شامل ہو گیئں۔تاہم بحیثیت مجموعی ناول سے سیاست اور دفتری افسر شاہی کے گٹھ جوڑ پر قاری ضرب لگتی ہے۔جوان،خوبرو اور حسین دوشیزہ نائلہ مخدوم ناظر حیات کی آخری داشتہ کے طور پر ناول میں جلوہ گر ہوتی ہے۔دولت منداور بااثر لوگوں کو سیڑھی کے طور پر استعمال کر کے وہ دولت اور شہرت حاصل کرنی کی خواہاں ہے۔وہ سیاسی ماحول میں تعمیر شدہ سفاک محلات میں مخدوم ناظر حیات تک اپنی غلام گردشوں میں رسائی حاصل کرتی ہے مگر طاقت ور بادشاہ گروں تک وہ اپنے نسوانی حسن سے پہنچتی ہے۔مخدوم ناظر حیات نے نائلہ کی سازشوں اور اس کی پشت پناہی کرنے والوں کو سمجھنے سے قطعی قاصر ہے۔باوجود اس کے کہ وہ نائلہ کو اپنی حیات سے یکسر نکال چکا ہے لیکن پھر بھی وہ اس کی سوچوں کے گوشوں میں کہیں نہ کہیں موجود نظر آتی ہے۔ابھی تک وہ اس لمحے کو فراموش نہ کر سکا۔پوکھٹ کے ساحلوں پر وہ اسے دھوکہ دینے کے بعد نجانے کن لوگوں کا آلہ کار بن چکی تھی اور اس کا رابطہ کن لوگوں کے ساتھ تھا کہ جب وہ واپس اپنے ملک پہنچی تو اس کے سماجی مرتبے اور حلقہ احباب میں ایک واضح تبدیلی رونما ہو چکی تھی جو اس کی ماضی کی زندگی سے بالکل بھی میل نہیں کھاتی۔اب مخدوم ناظر حیات اس کے لیے ایک قصہ پارینہ بن چکا تھا۔باوجود اس کے کہ اس کی رسائی مقتدر طبقات تک ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود بھی وہ مخدوم ناظر حیات کو کسی نہ کسی صورت میں اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور تھی۔شاید یہ اس کی سرشت میں شامل تھا یا کوئی کمزوری۔مخدوم ناظر حیات کے لیے ماضی کی ایک کہانی کی صورت اس کو فراموش کرنے کے بعد دوبارہ اس سے کوئی تعلق روا رکھنا ہر گز گوارہ نہ تھا۔تھائی لینڈ میں نائلہ نے اس کے ساتھ جس بے رخی کا مظاہرہ کیا مخدوم ناظر حیات اسے اگرچہ بھلا چکا تھا لیکن اس کے باوجود وہ نائلہ کی ذات کو اپنے دل سے نہ نکال سکا۔جس کا اظہار وہ کچھ اس انداز میں کرتا ہے:

> ''تھائی لینڈ میں نائلہ نے جو کچھ کیا مخدوم نے اسے فراموش کر دیا مگر اس کے باوجود وہ نائلہ کو فراموش کرنے پر قطعی مائل نہ تھا۔وہ اس کے لیے ایسی فائل تھی کہ جس پر تکمیل کا فیتہ باندھا جانا ابھی باقی تھا۔''(۲۷)

یہاں پر ناول نگار نے افسر شاہی نظام میں مستعمل فیتے کے نظام کو استعاراتی انداز میں پیش کیا ہے۔جس سے ناول نگار کا دفتری اور سرکاری نظام کے بارے میں شعور ابھر کر سامنے آتا ہے۔محمد حفیظ خان کے ہاں انتظامی اور افسر شاہی سے متعلق شعور پر مبنی موضوع کا اظہار یہ براہِ راست کم آتا ہے بلکہ اس کا ذکر زیادہ تر

استعاراتی اور علامتی انداز میں موجود ہے۔علاوہ ازیں انہوں نے اس نظام سے متعلقہ سیاسی موضوعات اور تصورات کا تذکرہ محض انسان دوستی یا روحانی شکل میں کیا ہے۔مذکورہ بالا اقتباس اس کی ایک واضح جھلک ہے۔ محمد حفیظ خان نے اس استعارے کے ذریعے اپنے موجودہ دور کے سیاسی وانتظامی مسائل کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کی تنزلی کو بھی اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ محمد حفیظ خان کے ناولوں میں معاشرتی سیاسی عمل اور دفتری انتظامی نظام جس طرح ذات کا ایک جزو بنتا ہے اور ناول کا پلاٹ خارجی سماجی حقیقت نگاری کے باوجود علامتی اور اشاراتی صورت اختیار کر لیتا ہے۔اس کی بنیادی وجہ محمد حفیظ خان کا حسی کشف ہے جو ان کے ناولوں میں تازہ خون کی مانند گردش کرتا اور انہیں نئی زندگی کی نوید سناتا ہے۔

اکیسویں صدی کے آغاز ہی سے وقت کی تیز رفتاری، مشینی اور مصنوعی زندگی، کم وقت میں زیادہ کے حصول کی تمنا، دولت کی چکاچوند، میڈیا، اقتدار کے حصول اور مختلف النوع پیچیدگیوں نے عصر حاضر کی زندگی کو عجیب و غریب طریقے سے یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔زندگی بسر کرنے کے اطوار میں تبدیلی آگئی ہے۔عزت و توقیر، سماجی مرتبہ، اخلاقی روایات سب کی میزان دولت اور حصول اقتدار بن چکے ہیں۔انسانی ہمدردی، مدد اور مروت، سب کے سب اپنا وجود کھوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔خود غرضی۔دھوکہ دہی اور استحصال ہی جیسے نئے سماج کا بیرومیٹر (Barometer) بن چکے ہیں۔دور حاضر کے سماج کے عمومی طور پر سرکاری عہدیداروں کو بھی جنگِ زرگری اور حصول اقتدار میں جکڑ دیا ہے۔وہ اپنے فرائض منصبی کو یکسر فراموش کر کے اقتدار کے حصول کی چکاچوند میں آلودہ ہو جاتے ہیں۔عہد حاضر میں بدعنوانیاں اور بے ایمانیاں جیسے انسانی معمولات کا ایک لازمی جزو بن چکی ہیں۔اب نہ وہ منظم انتظامی نظام ہے اور نہ ہی عدلیہ کے قوانین و ضوابط جو انسانی زندگی کے تحفظ کے ضامن ہیں۔

پاکستانی معاشرے میں انتظامیہ کی صورتحال خواہ اس کا روپ کوئی بھی ہو، اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں تسلی بخش نہیں۔کچھ روایت اور کچھ انفرادی کجرویوں کے باعث انتظامی معاملات اس نہج پر نہیں آ پاتے جہاں وہ واقعتاً عوام کے لیے خوشحالی اور امن و سکون کا باعث بن سکیں۔یوں تو سول سرونٹ کا معنی ''عوامی خدمتگار'' ہے لیکن موجودہ صورتحال اس میعار پر پورا نہیں اترتی بلکہ اکثر صورتوں میں تو اس کے برعکس دکھائی دیتی ہے اور ''خدمت گار'' حاکم کا روپ دھار لیتا ہے۔

محمد حفیظ خان نے ''کرک ناتھ'' میں انہی احوال و آثار کی عکاسی پر کام کیا ہے۔ یہ ناول ''۲۰۲۰ء میں لکھا گیا۔ اس کے تمام کردار ایک طرح کے ہیجان میں گرفتار ہیں۔ ناول نگار نے اپنی ماہرانہ پرکھ کی بدولت بیانیہ انداز میں افسر شاہی کی قباحتوں کو زیر تحقیق ناول میں فرضی کرداروں کی صورت میں عیاں کیا ہے۔ ناول کا آغاز ایک ایسے آس اور امید بھرے جملے سے ہوتا ہے جس میں سماجی زندگی کی سیاہ تلخیوں میں کہیں کسی کواڑ سے صاف روشنی کی کرن کے آنے کی ایک آس باقی ہے۔ یہیں سے ناول نگار محمد حفیظ خان کے معاشرے میں چار سو پھیلی ہوئی تلخیوں، استحصال اور ناانصافی پر عمیق مشاہدے اور ہمدردانہ جذبات کا اظہار ہوتا ہے جو کہ قاری کو اپنی کامل گرفت میں لے لیتا ہے۔ ناول کا انتساب بطور مثال ملاحظہ کیجیے: ''معاشرت میں پھیلی ہوئی کالک کے نام اس آس کے ساتھ کہ کہیں کوئی روشنی کی درز دکھائی دے۔''(۲۸)

دوسری جانب ناول کے عنوان کی استعاراتی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں جو اپنے مجازی معنوں میں ایک پوشیدہ حقیقت کا پردہ چاک کرتی ہے۔ ''کرک ناتھ'' مرغیوں کی وہ قسم شمار کی جاتی ہے جن کی ظاہری شکل وشباہت یعنی تمام اعضاء سیاہ رنگت کے حامل ہیں علاوہ ازیں ان کے باطن میں شامل خون اور ہڈیوں کی رنگت بھی کالی ہے۔ جو عصر حاضر میں چاروں طرف پھیلی ہوئی استحصال کی تاریکی کو ظاہر کرتی ہے۔ جب کسی معاشرے کی اخلاقی اقدار اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہوتی ہیں تو تب کسی حیات نو کا آغاز ہوتا ہے۔ زیر جائزہ ناول بھی اسی پس منظر اور آس وامید پر مبنی ناول ہے۔

محمد حفیظ خان چونکہ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہتے ہوئے اپنے فرائض منصبی انجام دے چکے ہیں اس لیے وہ معاشرے میں چہار سو پھیلی ناانصافی، استحصال اور سیاہ کاروں کے درپردہ ذمہ دار طبقات اور نظام کا مکمل ادراک رکھتے ہیں۔ انھوں نے سماج میں پھیلی ہوئی ناآسودگیوں اور المیوں کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ مصنف نے زیر جائزہ ناول میں افسر شاہی، سوشل میڈیا کے منفی اثرات، پولیس کے گھناؤنے کردار کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ مظلوم کے ردعمل اور طبقہ اشرافیہ کے استحصال کنندہ رویوں کی کہانی کو بھی بیان کیا ہے، پاکستانی سماج کی افسر شاہی، انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ عوام کی خیر خواہ کم دکھائی دیتی ہے۔ متعلقہ نظام جمود کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ ناول ''کرک ناتھ'' کے کردار بھی اسی موجودہ نظام سے فائدہ اٹھانے والے سیاہ ہڈیوں اور سیاہ خون والے افسر شاہی اور سیاسی نظام کی باہمی گٹھ جوڑ کے نمائندگان ہیں۔ افسر شاہی میں جہاں اور بہت سی قباحتوں کو منظر عام پر لانے میں ناول نگار نے ناول جیسی وسیع معنویت کی حامل صنف سخن کا انتخاب کیا وہاں اس کا ایک منفی پہلو

نظام کی سست روی بھی ہے۔اعلیٰ سرکاری افسران فائلوں پر بے جااعتراضات لگا کران کو واپس کر دیتے ہیں جس کی بدولت مختلف امور اپنے اختتامی مراحل پر پہنچنے کی بجائے التوا کا شکار ہو جاتے ہیں۔اس کا ذکر روزمرہ کی بنیاد پر سوشل میڈیا کی وساطت سے عوام کی سماعتوں تک پہنچتا ہے، عصر حاضر میں مختلف ٹی۔وی چینلز پر کاموں کی سست روی کی وجہ سے بیوروکریسی پر تنقید کی جاتی ہے۔زیر جائزہ ناول کا ایک مرکزی کردار زفیرہ احمد جو ایک مایہ ناز اشتہاری کمپنی کی مالکہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوش شکل اور ذہانت کا پیکر ہے۔وہ سماجی طور پر اپنا گھر بسانے کی عمر سے اب نکل چکی تھی اور تنہا ہی اپنی اشتہاری کمپنی کے کامیاب مستقبل کے لیے سر گرداں ہے۔اسی دوران ایک مشکل وقت میں کمپنی کی شہرت و ناموری بچاتے بچاتے وہ سرکار کے ایک ''بڑے صاحب'' کے مفادات کی خاطر اپنا نام، عزت اور وقار سب گنوا بیٹھتی ہے۔زفیرہ احمد اپنی کاروباری ساکھ کی تنزلی اور زبوں حالی کی بدولت عالم اضطراب میں خود کو پر سکون کرنے کی تگ و دو میں ٹیلی وژن کو آن کرتی ہے تو وہاں پر ملکی ابتری کی بہت سی وجوہات میں سے افسر شاہی کی سست روی کو بھی ایک اہم پہلو تصور کیا جارہا تھا۔جس کی تصویر کشی ناول نگار کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

> ''تقریباً سبھی چینلز پر ٹاک شوز میں حصہ لینے والے شرکاء ملک بھر میں چھائی ہوئی سیاسی ابتری، ناقص طرز حکمرانی، میگا کرپشن اسکینڈلز، بیوروکریسی کی کارکردگی پر چھائے ہوئے جمود اور روز افزوں مہنگائی پر ایک دوسرے کے زبانی لتے لے رہے تھے۔''(۲۹)

اگر زیر تحقیق ناول کا موضوعاتی مشاہدہ کیا جائے تو افسر شاہی کے ضمن میں بہت سے موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کی افسر شاہی بنیادی طور پر عوام کی خدمت گار تصور کی جاتی ہے پھر یہ استحصالی رویہ کیوں؟ جس کا جواب ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر سایہ تشکیل کردہ نظام نے ذاتی مفاد کی ترجیحات کی صورت میں دے دیا ہے۔پاکستانی افسر شاہی کو ناول کی نگاہ سے جانچنا اور پھر اس میں درپردہ حقائق کو منکشف کرنا ناول نگار کی ماہرانہ پرکھ ہے۔ناول میں کرداروں کا ناولاتی عمل (Action) کم اور افسر شاہی کے حوالے سے بالخصوص فائلوں کے گورکھ دھندے کے مربوط مباحث موجود ہیں۔اسی تمام صورت حال کے پیش نظر ناول کا موضوعاتی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا۔

مروجہ سرکاری دفتری نظام میں کئی اہم احکامات کی فائلیں دفتری ضابطہ کار کے گورکھ دھندے میں اپنی شناخت کھو بیٹھتی ہیں۔ایک اندیشہ یہ بھی ہے کہ کئی فائلیں ازخود بھی غائب کرادی جاتی ہیں۔گمشدہ فائل کی داستان ہر سرکاری دفتر کی داستان معلوم ہوتی ہے۔ہر فائل کسی نہ کسی وجہ سے کسی بھی میز پر گزشتہ کئی سالوں سے رکی ہوئی ہوتی ہیں۔ان فائلوں کی نوعیت کچھ بھی ہوسکتی ہے۔یہ فائلیں طبّی اداروں میں فراہم کی جانے والی سہولیات کے بارے میں بھی ہوسکتی ہیں،درس وتدریس کے اداروں میں بہتری کے لیے بھی ہوسکتی ہیں،کسی غریب طبقے کی دادرسی کی فائل بھی ہوسکتی ہے،احکامات کے مطابق دو گھنٹوں میں بھی عمل درآمد ہوسکتا ہے لیکن اگر افسر شاہی احکامات پر عمل کرنے میں سنجیدگی کا مظاہرہ نہ کرے تو معمولی کام بھی دو برسوں تک فائلوں میں بند رہتا ہے اور فائلیں دفتری نظام میں گم ہوجاتی ہیں۔

جہاں تک افسر شاہی کے اہم فیصلوں پر مخلصانہ اور شفاف عمل درآمد کا معاملہ ہے تو صرف ان معاملات پر مکمل عمل درآمد کیا جاتا ہے جن سے ان کا مفاد براہِ راست متاثر نہ ہو۔عموماً یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اکثر وبیشتر فیصلے ٹال مٹول،ثانوی موشگافیوں اور خاموشی کی دھول میں چھپانے کی سعی کی جاتی ہے۔اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے معاملات کے فیصلے رفتہ رفتہ عوام کی یاداشت سے یکسر محو ہوجاتے ہیں۔افسر شاہی نئے معاملات کے انبار میں الجھ جاتی ہے اور گزشتہ امور فائلوں کے بوجھ میں دب کر دم توڑ دیتے ہیں یا مفاد کے حصول کے وقت افسر شاہی اور سرمایہ داروں کے باہمی گٹھ جوڑ کے نتیجے میں تکمیلی مراحل سے گزرتی ہیں۔مفاد پرستی پر مبنی اس مروجہ نظام کی جھلک ہمیں محمد حفیظ خان کے ناول ''کرک ناتھ'' میں نظر آتی ہے۔مذکورہ ناول کے مرکزی بیانیے کے گرد چلتی ہوئی جو چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں وہ ایک طرف ہماری معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو منکشف کرتی ہیں تو دوسری طرف بدعنوانی میں ملوثّ افراد کے چہروں سے نقاب کشائی کرتے ہوئے ہمارے مقتدر طبقات اور سرکاری اہل کاروں کی کرپشن اور نااہلی کو بھی آشکار کرتی ہیں کہ جو درحقیقت ہمارے سماج میں لاقانونیت کو پروان چڑھا رہے ہیں۔اس ناول کے کرداروں کی صورت میں ہمیں اپنے معاشرے کی بعض متحرک تصویروں سے بھی شناسائی حاصل ہوتی ہے۔اس ناول کے تمام کردار ایک دوسرے کے ساتھ ملتے دکھائی دیتے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے کے لیے تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ناول کے تہ دار اور پر معنی بیانیے میں ایک اہم کردار دانش سعید کا ہے جو کہ کاروباری دنیا سے تعلق رکھنے والا ایک مضبوط کردار ہے۔دیہات کی زندگی سے نکل کر بڑے شہر میں آکر حیاتِ نو کا آغاز کرتا ہے۔بحیثیت ایک کامیاب بزنس مین بڑے پیمانے پر

سرمایہ کاری کرنا اس کے لیے ہمیشہ سے باعثِ کشش رہا ہے لیکن اس دفعہ اس کی کاروباری ساکھ کو زک پہچانے کے لیے ایک بڑے عہدیدار نے اس کی سپورٹس گاڑیوں کی پہلی درآمدی کھیپ کے معاملے کو التوا میں ڈالنے کے لیے فائلوں کی نظر کر دیا۔ دانش سعید اور بڑے صاحب کے مابین کاروباری کشاکش گزشتہ کچھ عرصے سے چلی آ رہی تھی۔ دانش سعید پہلی درآمدی کھیپ کو مرکزی اور صوبائی سطح پر عبوری حکومت کے قیام سے قبل لانے کا خواہاں تھا جبکہ بڑے صاحب اس کی تمام تگ و دو کو ناکام بنا کر مردِ میداں بننے کا متمنی تھا۔ بڑے صاحب بظاہر کسی بھی ابلاغی ذرائع کی ملکیت کا دعویدار نہیں تھا تاہم اس کے منصب اور اس کی رسائی سے تمام طبقات آشنا تھے لیکن وہ ظاہری طور پر اعتراف سے گریزاں تھے۔ یہاں سیاستدانوں، سرمایہ کاروں، جاگیرداروں اور اعلیٰ عہدیداران کی باہمی چپقلش کی تصویر کشی زیرِ تحقیق ناول 'کرک ناتھ' میں عمدگی کے ساتھ کی گئی ہے۔ یہ ہمارے مروجہ سماج کی کہانی ہے۔ یہ ناول آغاز سے انجام تک معاشرت کے مشاہد کے ترجمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ ناول کے تمام بیانیے کو پیچیدہ انداز میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں بیک وقت متعدد کہانیاں متوازی چلتی ہیں۔ کئی واقعات اور کردار پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ ایک کہانی دوسری کہانی میں مدغم ہوتی محسوس ہوتی ہے، تاہم ناول کا بنیادی مقصد اور مرکزی خیال ان تمام حصوں کو باہم مربوط رکھتا ہے۔ دانش سعید کی معروف برانڈ کی اسپورٹس کار کی درآمد کے اجازت نامے گزشتہ چار برسوں سے التوا کا شکار تھے لیکن اب مقتدر طبقات اپنے مفاد کے حصول کی خاطر وہ اجازت نامے عطا کرنے کے حامی تھے۔ اس تمام تر سازش کے ضمن میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''پارٹی کے مرکزی دفتر میں ہونے والی ملاقات میں دانش سعید کو صاف صاف بتا دیا گیا کہ اس کی جانب سے معروف برانڈ کی اسپورٹس کار کی درآمد کی اجازت کے سلسلے میں چار برس پہلے دی گئی درخواست پر اجازت عطا کی جا سکتی ہے اگر ایک بہت بڑی رقم کسی فرنٹ مین کے ذریعے فنڈ میں جمع کرا دی جائے۔''(۳۰)

ناول کے درج بالا اقتباس سے سیاستدانوں اور افسر شاہی کے باہمی گٹھ جوڑ فائلوں کی منظوری کے پسِ پردہ محرکات کا پردہ چاک کیا گیا ہے، یوں فائلوں کو التوا میں رکھنے اور ان کی منظوری کے عمل سے بھی آشنائی حاصل ہوتی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ناول 'کرک ناتھ' میں ہمیں سماجی اور سیاسی زندگی کا احوال زیادہ ملتا ہے۔ ناول کی دنیا میں جس سچ کی عکاسی ہے وہ ہماری زیست کی صداقت کے قریب تر ہے۔ ناول کی کہانی میں

سماج کی معروف حقیقتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ خوش آئند اور باعثِ مسرت عمل یہ ہے کہ ہمارے معاصر ناول سماجی و سیاسی زندگی کی تفہیم بھی کر رہے ہیں۔ سماجی صورتِ حال میں فرد کی باطنی و ذہنی کیفیات کا احاطہ کیا جارہا ہے۔ ناول کے فن کو انسانی کیفیات، معاصر سیاست، انتظامی مسائل، سماج اور وقت سے دور نہیں کیا جاسکتا۔ اس ناول کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سماجی عدم مساوات اپنے اسفل ترین اظہار کے طور پر سیاست میں اقدار کے زوال، انتقامی سماجی تحریکات اور افسر شاہی کی سفاکی کے طور پر منظر عام پر آتی ہے۔ گو کہ مذکورہ ناول معاصر سماجی اور سیاسی حقائق پر مبنی ہے لیکن اس میں عام قاری کا تجسس برقرار رہتا ہے۔ ناول نگار نے کہانی کو بیان کرنے کے لیے جو بیانیہ استعمال کیا ہے وہ ایک عام نوعیت کے موضوع کو بھی قابلِ مطالعہ بنا دیتا ہے۔ پاکستانی سماج میں افسر شاہی کی بدولت انسانی استحصال ایک تلخ حقیقت ہے لیکن یہ موضوع روزمرہ کی بنیاد پر میڈیا اور اخبارات میں زیرِ بحث رہتا ہے۔ متعلقہ موضوع کو متاثر کن انداز میں قارئین تک پہچانا ایک مشکل امر ہے تاہم محمد حفیظ خان نے اس موضوع کو عمدہ انداز میں برتا ہے۔ ناول میں سرکاری سطح پر فائلوں کے نظام کو واقعات اور کرداروں کی صورت میں نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق فائلوں پر مبنی نظام کار سست روی کا شکار ہے اور اعلیٰ عہدیداران فائلوں پر بے جا اعتراضات لگا کر انہیں داخل دفتر کر دیتے ہیں۔ عوام الناس کو بارہا دفعہ دفاتر کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ سرکاری امور کو اولین ترجیح نہیں دی جاتی۔ اعلیٰ سطح پر فیصلہ سازی بھی سست روی کا شکار دکھائی دیتی ہے۔ مختلف محکمے اور طبقات ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔ اکثر اوقات یہ سننے میں آتا ہے کہ فلاں کام کی فائل فلاں سرکاری محکمے کے کسی عہدیدار کے پاس موجود ہے لیکن اس پر کوئی عملی کاروائی نہیں ہوئی۔ نتیجتاً سائل کو دفاتر کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ فائلوں کی اس ترسیل و وصولی اور اس کے پسِ پردہ حقائق کو ناول میں بیان کیا گیا ہے۔

ملک میں ہونے والے انتخابات کے لیے کثیر سرمایہ درکار تھا اور یہ سرمایہ عموماً افسر شاہی کی معاونت سے امپورٹرز اور ایکسپورٹرز سے تعطل کے شکار اجازت ناموں کی منظوری کی صورت میں وصول کیا جاتا ہے۔ ناول کے کردار دانش سعید کو ان حالات کے پیش نظر انکم ٹیکس کی نادہندگی کی صورت میں رقم کی ادائیگی کا احتمال تھا۔ جس کے لیے وہ ہمہ وقت تیار تھا۔ ناول نگار کے الفاظ میں ناول کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''سبھی جانتے تھے کہ تقریباً آٹھ ماہ بعد ملک میں عام انتخابات ہونے والے تھے اور اس سلسلے میں حکمران جماعت سمیت ہر پارٹی کو اپنے اکاؤنٹ میں زیادہ سے زیادہ

رقم چاہیے تھی اور یہ رقوم دیگر ذرائع کے علاوہ عام طور پر امپورٹرز اور ایکسپورٹرز کے رکے ہوئے اجازت ناموں کی منظوری کی صورت اکٹھی کی جاتی ہے۔ دانش سعید کو اس رقم کی ادائیگی پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن اسے اتنی یقین دہانی چاہیے تھی کہ پارٹی کی حکومت جانے سے پہلے اس کی سب سے بڑی درآمدی کھیپ ملک میں آچکی ہو گی۔ دانش سعید کی مطلوبہ یقین دہانی کے جواب میں اس کے انکم ٹیکس کے معاملات کی تین بڑی فائلیں اس کے سامنے رکھ دی گئیں کہ جن کی بنا پر اس کے جملہ کاروباری اثاثے نادہندگی کے زمرے میں ضبط کر لیے جاتے۔"(۳۱)

محمد حفیظ خان کا یہ ناول معاشرے کے ایک فرد کا المیہ بھی ہے اور پوری قومیت کا المیہ بھی۔ یہ ہمارے سماج کے ہر ذی شعور فرد کی جانی پہچانی زندگی ہے۔ بظاہر یہ ناول ایک نسوانی کردار ذفیرہ احمد کا المیہ ہے لیکن مذکورہ ناول میں توجہ طلب اور قابلِ غور متعدد معاملات ہیں۔ یوں ناول ہذا ایک فرد کی شکست خوردگی اور سماجی انتشار کا آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ دعوتِ فکر بھی دیتا ہے۔ اس ناول کو پڑھنا عصری زیست کے پورے کرب سے دوچار ہونا ہے۔ یہیں سے وجودی بحران کی شروعات ہوتی ہیں۔ محمد حفیظ خان کو اس معاشرے کے مختلف طبقات اور اداروں کا مکمل ادراک حاصل ہے۔ وہ اس بات سے بخوبی آشنا ہیں کہ افسر شاہی میں افسر و ماتحت کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ انہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ایسی ایسی تصویریں پیش کی ہیں جو طرح طرح کی بدیانتی کو بے نقاب کرتی نظر آتی ہیں۔ قدم قدم پر انسانی ضمیر چھلنی ہوتا ہے اور وہ روحانی موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ یہ ناول ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم سماج کی قباحتوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ناول نگار کا ناول کے آغاز سے اختتام تک یہی منصب رہا ہے کہ وہ معاشرے کو آئینہ دکھائے، سچ بولے اور حقیقت کا برملا اظہار کرے۔

گزشتہ کئی برسوں سے پاکستان کی افسر شاہی پر بدعنوانی، سرخ فیتہ شاہی، آمریت اور من مانی جیسے الزامات میں جس برق رفتاری سے اضافہ ہو رہا ہے اس کے پیشِ نظر یہ کہنا قطعی غیر مناسب نہیں ہو گا کہ افسر شاہی استحصال کا ایک حصہ بن کر رہ گئی ہے۔ اپنے مفاد کے لیے سیاست اور افسر شاہی نے آپس میں گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔ جس کی نشاندہی ہمیں زیرِ تحقیق ناول 'کرک ناتھ' میں ملتی ہے۔ بڑے صاحب کا سیاست میں آنا اور

وزیرِ تجارت کے عہدے کی بنیاد پر اپنے مفاد کا حصول مذکورہ بالا المیے کی عکاسی ہے۔اکیسویں صدی کے یہ معاصر ناول نئے موضوعات کی ترجمانی کے طور پر منظرِ عام پر آئے ہیں۔تاریخ میں بنی نوع انسان پر جبر واستبداد کی داستان بہت قدیم ہے شاید خود انسان جتنی قدیم۔انسانی زیست میں جبر کا فلسفہ مقتدر طبقات نے ازل سے روا رکھا ہے۔معاشرے کو مجموعی طور پر زیرِ تسلط رکھنا نوآبادیات کی مجبوری ہے کیونکہ ان کی اپنی سلامتی و بقا سماج میں ظلم کے رواج سے مشروط دکھائی دیتی ہے۔ناول نگار کا معاشرہ تو ایسے مخمصے میں مبتلا ہے کہ جس کی مثال دنیا میں فی زمانہ ملنا قطعی مشکل امر ہے۔ناول میں زندگی کا مرقع ہے۔اس میں ایسے کردار پیش کیے گئے ہیں جو حقیقی سے بھی حقیقی لگتے ہیں۔ممتاز احمد خان کا ناول کے بارے میں نقطہ نظر یہ ہے:

> ''ناول دراصل طویل دورانیے کے ایسے قصے کو کہتے ہیں جس میں پورا عہد سانس لیتا نظر آتا ہے۔اس کے کردار حقیقی ہوتے ہیں نیز یہ کہ اس میں پلاٹ کا خمیر اصل زندگی سے اٹھایا جاتا ہے۔''(۳۲)

محمد حفیظ خان نے ناول میں ایسے کرداروں کو پیش کیا ہے جو حقیقی دکھائی دیتے ہیں۔بڑے صاحب کا کردار اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ہمیں زندگی میں کہیں نہ کہیں ایسے کرداروں سے واسطہ پڑتا ہے۔بالخصوص افسر شاہی کے ضمن میں عوام الناس کا نقطہ نظر بھی یہی ہے۔دانش سعید،ذفیرہ احمد،ماہین اور دیگر کردار اس قدر حقیقی زندگی کے قریب معلوم ہوتے ہیں کہ بعض اوقات تو یہ شائبہ تک ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی حقیقی زندگی میں وہی کچھ کیا جو ناول ہذا میں پیش کیا گیا ہے۔ایسے کردار حقیقی سے بھی حقیقی لگتے ہیں۔ناول کا موضوع ہی ایسا ہے کہ جس سے محمد حفیظ خان کے سماج اور مقتدر طبقات کے استحصالی رویوں کے ضمن میں مرکزی نقطہ یا فلسفیانہ فکر کی عکاسی ہوتی ہے۔چونکہ وہ اس شعبے کا حصہ رہ چکے ہیں۔اس حوالے سے نجیب خان محمد حفیظ خان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''۲۰۱۸ء''ادھ ادھورے لوگ''،۲۰۱۹ء''انواسی''،۲۰۲۰ء'کرک ناتھ' تین سال اور تین مسلسل ناول،جنہیں تصنیف کیا ہے جانے مانے افسانہ نگار،ڈرامہ نگار،شاعر (بھی)،کالم نگار،نقاد اور ان سب سے سوا مورخ اور محقق محمد حفیظ خان نے جن کا بڑا گہرا تعلق پاکستان کے جوڈیشل سول اور کریمنل سسٹم سے رہا ہے اور جو وفاقی و صوبائی سول سروس سے وابستہ رہنے کی وجہ سے نہ صرف سسٹم کو سمجھتے

ہیں بلکہ جنوبی پنجاب کی محرومیوں سے لے کر پنجاب اور وفاق کے دارالحکومتوں میں اقتدار کی غلام گردشوں میں جنم لینے والے طاقت کے کھیل، مقتدر طبقے کے مفادات، میڈیا گروپس کے مالکان اور بزنس مینوں کے اقتدار پر حاوی ہونے جیسے معاملات پر گرفت رکھتے ہیں۔"(۳۳)

محمد حفیظ خان گزشتہ دور کی طرح زیرِ بحث دور میں بھی اپنے ناولوں کا مواد اپنے گردوپیش کی زندگی سے لیتے ہیں اور اپنے عہد کے سماجی مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بناتے ہیں۔ وہ دورِ حاضر کے سیاسی و سماجی اور انتظامی بالخصوص افسر شاہی کے متعلقہ امور سے متاثر ہوئے۔ اسی دور میں محمد حفیظ خان کو ادب، افسر شاہی اور سیاست کے رشتے کا عرفان ہوا۔ ان کو یہ احساس ہوا کہ افسر شاہی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے اور اس سے فرار کی راہ اختیار کر کے ادیب اپنی ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ ناول میں تمام باتیں ایسی ہیں جو عصرِ حاضر کے سماجی نظام میں تقریباً تمام سرکاری و غیر سرکاری شعبوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ناول ہذا میں سماج کا مکروہ چہرہ نظر آتا ہے۔ یہاں یہ واقعات کرداروں کے عمل سے آگے کی جانب نہیں بڑھتے بلکہ حالت و واقعات کی سنگینی ان کو آگے بڑھاتی ہے اور یہی صورتِ احوال ناول میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ناول میں اتنی پیچیدگیوں اور الجھاؤ کے باوجود ناول نگار نے پریشانیوں کا حل نئے طریقوں سے تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ ناول نگار نے حالیہ معاشرتی صورتحال کے تجزیے کے ساتھ ساتھ کرداروں کے باطن کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ کرداروں کے اندرونی ہیجان کو خود ان کے باطن میں داخل ہو کر روح یا ضمیر کی آواز کے ذریعے قلم زن کیا ہے۔ یہ کیفیت ذفیرہ، ماہین، شاکا، کاشی، دانش سعید کے کرداروں میں عام طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ ناول نگار نے جب بھی بہت کچھ کہنا چاہا کردار کی داخلی کیفیات کا بیان مقصود ہوتا تو خود ضمیر یا اندرون کو متشکل کر کے کردار کی داخلی کیفیات کو بیان کیا ہے۔ ناول نگار نے یہ طریقہ ناول ہذا میں جگہ جگہ اختیار کیا ہے۔ انسان کی ذات کے اندر پنہاں قوتوں اور سماج میں موجود مقتدر طبقات کی پیچیدگیوں دونوں کے امتزاج سے جنم لیا ہے۔ اعلیٰ سرکاری اداروں میں پھیلی ہوئی بدعنوانیاں عوام میں بے اطمینانی اور مایوسی کو پیدا کرتی ہیں۔ اسی مسئلے کو محمد حفیظ خان نے اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے کہ کس کس طرح سے سرکاری عہدوں پر فائز افسران، سیاسی لیڈر اور اسمبلی کے کارکن ان بدعنوانیوں کو فروغ دینے میں مدد کر رہے ہیں۔ ناول میں اسی مسئلے نے ایک سوال پیدا کیا

ہے کہ کیا اکیسویں صدی کے اختتام پر بھی ایسی ہی بد عنوانیوں اور پیچیدگیوں کا اظہار یہ ہے۔ سہیل بخاری ناول کے موضوع کی بابت لکھتے ہیں:

> ''ناول میں زندگیوں کے مرقعے پیش کیے جاتے ہیں۔ حقیقی اور واقعی۔ موضوع کے اعتبار سے اس کا میدانِ عمل بہت وسیع ہے، اتنا ہی وسیع جتنی خود زندگی۔''(۳۴)

ناول زندگی کی تبدیلیوں کا رفیق ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ناول میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ ابھی تک افسر شاہی میں دفتری فائلوں اور ان کے گورکھ دھندوں کا وہی روایتی طریقہ رائج ہے نوآبادیاتی عہد میں مروج تھا۔ جس کے پیچھے کئی طبقات کے مذموم مقاصد موجود ہیں۔ جن کا ذکر ناول میں بھی کیا گیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جدید تبدیلیوں اور ترقیوں کو ناول اپنا موضوع بنا رہا ہے۔ شاید عہدِ حاضر میں سرکاری اداروں میں ایسی بد عنوانیاں اس برق رفتاری سے بڑھ چکی ہیں کہ ان کے لیے متعدد ناول تحریر کیے جا چکے ہیں۔ دورِ حاضر کی زندگی میں وقت کی مانند کہیں ٹھہراؤ نہیں ہے، زندگی ہر لمحہ تغیر پذیر نظر آتی ہے۔ یہ تغیر آج کے سماج میں تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ نہ سیاست اعتدال کی حامل ہے اور نہ افسر شاہی کے مسئلوں میں ٹھہراؤ۔ روز بروز سیاسی مسائل، سماجی زندگی کی پیچیدگیاں جس میں سرکاری دفاتر میں سست روی، سرکاری ملازمتوں میں رشوت خوری، سیاسی پارٹیوں میں پارٹی بندی کے تحت نظریات میں اختلاف کو ذاتی مفادات کے حصول کے لیے استعمال کرنا، موجودہ سیاست کی بد نظمی، افسر شاہی میں امور کی انجام دہی میں طوالت، سرکاری اداروں میں سفارش کی دخل اندازیاں، مستقبل کی بے یقینی، عدم محفوظیت کے خطرات و خدشات شامل ہیں جیسا کہ اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں:

> ''ادب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں اور زندگی مسلسل تغیر و تبدل کی کہانی ہے۔ زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے اور اسے عروج کی راہ دکھاتا ہے اور جملہ بنی نوع انسان کی آرزو رکھتا ہے۔''(۳۵)

افسر شاہی کی انہی قباحتوں کی عکاسی کے حوالے سے اکیسویں صدی میں منظر عام پر آنے والا حفیظ خان کا ایک اور شہرہ آفاق ناول ''نتارا'' ہے۔ جو کہ صریر پبلیکیشنز کی جانب سے ۲۰۲۱ء میں شائع کیا گیا۔ ان قباحتوں

کی عکاسی میں ناول نگار نے کوئی ستائشی رویہ اختیار نہیں کیا۔انھوں نے تمام مسائل کو سمجھا اور زندگی اور سماج میں ان کے کردار کو جیسا دیکھا ویسا ہی سپرد قلم کر دیا۔ مقتدر طبقات کی ارضی صورت کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے ان طبقات کے مابین پائی جانے والی کشمکش اور اتار چڑھاؤ کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ یہاں ہم اس ناول میں موجود افسر شاہی نظام میں موجود فائلوں کے گورکھ دھندے کا جائزہ پیش کریں گے۔

ناول کے عنوان ''منتارا'' کے معنی و مطالب کی تفہیم کو دیکھیں تو منتارا سے مراد ایک ایسا آدمی ہے جس کو تیرنے کا فن قطعاً نہیں آتا۔تاہم وہ اس تکبر اور زعم میں گرفتار ہے کہ وہ ایک ماہر تیراک ہے۔ مجموعی طور پر زیر تحقیق ناول ''منتارا'' ہمارے دور حاضر کے سیاسی نظام کی تلخ سیاہ کاریوں کی ایک ایسی کہانی ہے جو کہ حکومتوں کی تشکیل اور استخراج کی سیاہ تاریخ کے سیاہ ترین ابواب پر مشمول ہے۔ جس کے پس پردہ کئی آلہ کار اور محرکات ہیں جو کہ اس کہانی کے تار و پود بنانے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ سیاسی نظام کی غلام گردشیں اور اس سے متعلقہ افسر شاہی (Bureaucracy) کے کردار کی عکاسی ایک ایسے منجدھار کی سی ہے کہ جہاں پر ہر رشتہ خواہ اس کا کوئی بھی روپ ہو جذباتی وابستگی کی نسبت مفاد پرستی کو اولین ترجیح دیتا ہے۔ ناول میں مختلف کردار ہیں جن میں مخدوم ناظر حیات، نائلہ، فرحان، صباحت، منصور قریشی، چوہدری کبیر حسین، مخدوم زادہ ہادی حیات ، کشور النساء، سریندر اور سلمیٰ حیات وغیرہ نمایاں حیثیت کے حامل کردار ہیں۔ ناول کی کہانی مرکزی کردار ''مخدوم ناظر حیات'' کے گرد گھومتی ہے جو اپنی سیاسی زندگی میں ایک طویل عرصے تک سیاست کے میدان میں ایک سرگرم رکن تھا۔تاہم اب وہ عمر کے اس حصے میں داخل ہو چکا ہے جہاں سیاسی مفادات اس کے لیے اہمیت نہیں رکھتے۔اب صرف وہ زندگی کے بقیہ لمحات سے لطف کشید کرتا ہے۔ جس کے لیے وہ کبھی ''پوکھٹ'' کے ساحلوں کا انتخاب کرتا ہے تو کبھی کولمبو (سری لنکا) کے ہوٹلوں میں کسی دوشیزہ کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔اس کی غیر موجودگی میں اس کی املاک و جایئداد کی دیکھ بھال اس کا بیٹا مخدوم ہادی حیات کرتا ہے جو کہ بذات خود بھی صوبائی اسمبلی کا ایک رکن ہے۔ مخدوم ناظر حیات ذاتی انتقام کا نشانہ بنتے بنتے ''ڈیپ اسٹیٹ'' کے فلسفے کی بنیاد بنتا ہے۔ ناول میں ناول نگار اس سیاسی اقتدار کے حصول کی کشمکش میں افسر شاہی کے ضمن میں فائلوں کے انبار اور گورکھ دھندے کو ناول کی شکل میں قارئین تک پہنچایا ہے تاکہ اس امر کی جانب توجہ مبذول کرائی جاسکے۔ حکومتی نظام میں بھی فائلوں کا یہی روایتی طریقہ کار مستعمل ہے جو کہ حکام کی عدم دلچسپی اور عدم توجہی کا شکار ہے۔اس کے متعلق ناول نگاریوں گویا ہوتے ہیں:

''ویسے بھی وزیر اعظم سیکریٹریٹ میں اس نوعیت کی فائلوں کا انبار لگا ہوا تھا کہ جن میں اپوزیشن کی جانب سے اٹھائے گئے سوالات، لگائے گئے الزامات اور حکومت جانے کی ہر دن بدلتی ہوئی ڈیڈ لائن دی گئی ہوتی۔ ایسی سبھی فائلوں کو داخل دفتر کرتے ہوئے کبھی کبھار کسی وزارت سے کوئی ہدایت جاری کر دی جاتی وگرنہ محض فائل کرنے کا حکم۔ اب جن فائلوں میں نہ تو وزیر اعظم دلچسپی لے اور نہ ہی کوئی ادھر ادھر سے پوچھنے والا ہو تو انہیں ریکارڈ روم میں پھینکتے ہوئے وہ فائلیں بھی اسی انجام سے دوچار ہوئی رہتی ہیں کہ جن میں کہیں کوئی چھوٹی موٹی ہدایت جاری کی گئی ہوتی اور اگر خوش قسمتی سے ایسی کوئی فائل ہدایت کی گئی وزارت میں پہنچ بھی جاتی تو ایک اور برف خانہ اس کا منتظر ہوتا، پھر کسے یاد رہتا کہ کون سی فائل پر کس کے نام کیسا ڈائریکٹو جاری کیا جاتا تھا۔''(۳۶)

زیر تحقیق ناول میں سیاسی اقتدار کے حصول کے اس کھیل میں بھی افسر شاہی کے متذکرہ بالا المیے کو بیان کیا گیا ہے۔ بہت سے اہم معاملات طوالت کے پیش نظر فائلوں کی نظر کر دیے گئے۔ ہمارے مروجہ سیاسی نظام میں سیاستدانوں کی سرشت کے مطابق افسر شاہی عوام کی خدمت کے لیے نہیں بلکہ انتظامی و حکومتی امور کی انجام دہی اور معاونت کے لیے ہے۔ عمومی طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ملک میں چلنے والی تحریکوں کی پشت پناہی کے لیے ناگزیر ہے تاکہ کسی بھی تحریک کو پروان چڑھایا جا سکے۔ ناول میں ناول نگار نے موجودہ سیاسی عدم استحکام کا جائزہ لیا ہے کہ جب موجودہ وزیر اعظم کو برطرف کرنے کے لیے ملک بھر میں تحریکیں چلائی جا رہی تھیں اور مخالفین کی جانب سے تحریک عدم اعتماد بھی پیش کی گئی ان تذبذب اور اضمحال کے شکار حالات میں افسر شاہی سمیت کسی نے بھی موجودہ وزیر اعظم کا ساتھ نہ دیا اور فائلوں پر مبنی طوالت کا شکار نظام بروئے کار لایا گیا۔ تمام تر طبقات نے روابط کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ ناول نگار نے اس باہمی کشمکش کو اپنی زبانی کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

''وزیر اعظم نے مختلف وزراء سے رابطے کی کوشش کی مگر کوئی بھی دستیاب نہیں ہو رہا تھا۔ نوکر شاہی نے الگ فائلیں سمیٹ لیں اور دفتر بڑھا دیے۔''(۳۷)

مذکورہ بالا اقتباس میں افسر شاہی نظام کی قباحتوں کے ضمن میں فائلوں کے انبار پر مبنی نظام کی عکاسی کی گئی ہے جو کہ اس نظام کو جامد کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ فائلوں کو داخل دفتر کرنا یا اس کا حکم اس نظام میں موجود ہوتا ہے جس کی تصویر کشی مختصر اور جامع انداز میں کی گئی ہے۔ یہاں وہ ذہنی اضطراب اور مقتدر طبقات کی قطع نظری بھی نمایاں ہوتی ہے جو اس نظام کی بے رخی اور عوام کی محرومی اور یاس کی عکاسی کرتی ہے۔ ناول نگار نے استحصال کی اس فضا کو بخوبی بیان کیا ہے جو عصر حاضر میں افسر شاہی نظام کے تحت رائج ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عبدالقیوم ملک (ر)، لیفٹیننٹ جنرل، فکر و خیال، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۶۵

2.Kiran Khurshid,A Treatise on Civil Service of Pakistan;The Structural-Functional History(1601-2011),2011,Pak TM Printers,Faisalabad,P.1

3.Brig Tariq Masood,National Defence Cource Group Research Officer Good Governance,National Defence College,Islamabad,1999-2000,P.30

4.Sana Rauf,Effects of Red Tape in Public Sector Organizations:A Study of Government Department in Pakistan,Published in Public Administration and Policy,Emerald Publishing limited,Vol.23,P.327

5. Ibid, P.331

٦۔عماد چودھری،ایک اور آتشزدگی، حکومت کو کیا کرنا چاہیے،روزنامہ دنیا،۲۵اکتوبر۲۰۱۸ء،ص۱

۷۔سید احتشام حسین، تنقیدی جائزے(دیباچہ)،احباب پبلشرز، لکھنو،۱۹۵۶ء،ص۷

۸۔سید محمد عقیل،ڈاکٹر،احتشام حسین کی تنقید نگاری(مضمون)، مشمولہ رسالہ آہنگ،احتشام حسین نمبر،۱۹۹۳ء،ص۱۲۷

۹۔سید محمد عقیل،ڈاکٹر، نئی فکریں، خیابان پبلشرز،الہ آباد،۱۹۵۳ء،ص۴۰

۱۰۔سامرسٹ ماہم، نئی قدریں(ماہنامہ)، شمارہ نمبر۱۹۵۹،۳ء،ص۳۴۳

۱۱۔سید محمد عقیل،ڈاکٹر،جدید ناول کا فن، نیا سفر پبلیکیشنز،الہ آباد،۱۹۹۷ء،ص۹۰

۱۲۔اظہر حسین، خالد فتح محمد کا فکشن(مضمون) مشمولہ سہ ماہی ادبیات، خصوصی نمبر:اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ (جلد دوم)، شمارہ نمبر ۲۲۔۱۲۱،اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۱۹ء،ص۱۲۷

۱۳۔ تحسین بی بی، ڈاکٹر، اردو ناول 'حاصل گھاٹ' میں سیاسی پہلو کا تنقیدی جائزہ (مضمون)، مشمولہ سہ ماہی ادبیات، خصوصی نمبر: اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ (جلد دوم)، شمارہ نمبر ۲۲۔۱۲۱، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۹ء، ص ۲۰۔۲۲۱

۱۴۔ انیس اشفاق، معاصر اردو ناول (نئے تنقیدی تناظر ہندوستانی ناول نگاروں کے حوالے سے)، مشمولہ سہ ماہی ادبیات، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۹ء، ص ۹

۱۵۔ خالد فتح محمد، پری، برائٹ بکس پبلشرز اینڈ بک سیلر، اردو بازار لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۵۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۱۷۔ عابد علی عابد، سید، اصولِ انتقادِ ادبیات، لاہور سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۵۰۲

۱۸۔ خالد فتح محمد، پری، ص ۱۵۸

۱۹۔ طاہرہ سرور، ڈاکٹر، عساکر پاکستان کی ادبی خدمات اردو نثر میں، لاہور اکادمیات، ۲۰۱۳ء، ص ۱۴۷

۲۰۔ خالد فتح محمد، ص ۱۰۸

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۲۲۔ محمد علی خالد، جی، ایچ، کیو سیاست، مسیحا پبلیکیشنز حیدر آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۲۴۲

۲۳۔ مہ جبین اختر، خالد فتح محمد کی ناول نگاری، مقالہ غیر مطبوعہ، مملوکہ: لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۷ء، س ۱۹

۲۴۔ خالد فتح محمد، پری، ۹۲

۲۵۔ ایضاً، ص ۹۲۔۹۳

۲۶۔ ایضاً، ص ۹۱

۲۷۔ محمد حفیظ خان، منتارا، صریر پبلیکیشنز، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء، ص ۱۲۳

۲۸۔ محمد حفیظ خان، کرک ناتھ (انتساب)، بک کارنر جہلم، پاکستان، ۲۰۲۰ء، ص ۳

۲۹۔ ایضاً، ص ۵۳

۳۰۔ایضاً، ص ۷۵

۳۱۔ایضاً، ص ۱۰۳

۳۲۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اردو ناول، انجمنِ ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۴۹

۳۳۔ نجیب جمال، ناول کرک ناتھ۔۔۔۔ایک جائزہ (مضمون)، مشمولہ ماہنامہ بک ڈائجسٹ لاہور، محمد حفیظ خان نمبر، جلد ۱۷، شمارہ ۳۔ ۲۰۲۰، ۴ء، ص ۸۰

۳۴۔ سہیل بخاری، اردو ناول نگاری، مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۱۵۔۱۶

۳۵۔اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۱

۳۶۔ محمد حفیظ خان، منتارا، ص ۱۳۹

۳۷۔ایضاً، ص ۲۱۹

باب سوم:

افسر شاہی میں افراد کی بد عنوانی اور معاصر اردو ناول میں اس کی عکاسی

الف: افراد کی بد عنوانی کی صورتیں

1): رشوت

لغوی تعریف:

''رشا''یعنی ڈول کی رسی۔تاہم ''رشا''رسی کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ ''ڈول میں رسی لگائی۔''حافظ محمد سعد اس تعریف کی توضیح کچھ یوں کرتے ہیں:

> ''لغت میں رشوت کا لفظ ''رشا''سے ماخوذ ہے جس کا اطلاق رسی اور خصوصاً ڈول کی اس رسی پر ہوتا ہے جس کے ذریعہ کنویں سے پانی نکالا جاتا ہے۔چونکہ رشوت بھی ایک مطلوبہ چیز تک پہنچنے اور اس کو حاصل کرنے کا واسطہ و ذریعہ بنتی ہے اس لیے اس کو رشوت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔''(۱)

اصمعی کے مطابق: جب حنظل کی بیلیں پھیل جاتی ہیں تو اس وقت کہا جاتا ہے ''ارشت''یعنی بیلوں نے پھیل کر ٹہنیوں کی صورت اختیار کر لی جیسے رسی ہو جاتی ہے۔

''ابن الاعرابی'' کے نقطہ نظر کے مطابق: ارشی الرجل،یعنی اونٹنی کے بچے کی سرین کو کھجلایا تاکہ وہ اس کی دوڑنے کی رفتار میں اضافہ ہو جبکہ اوٹنی کے بچے کو ''رشی'' بھی کہا جاتا ہے۔

''لیث'' کے مطابق: رشو یعنی رشوت کا فعل

رشوت کے مفہوم کے حوالے سے منذری نے ابوالعباس کا قول کچھ یوں بیان کیا ہے کہ ''رشوۃ''کا لفظ ''رشاالفرخ''سے اخذ شدہ ہے۔یہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب چوزہ اپنی گردن کو آگے بڑھا کر سر ماں کی طرف کر لیتا ہے تاکہ وہ اسے دانہ کھلا سکے۔فرید وجدی کے مطابق رشوت کی تعریف یوں کی گئی ہے:''یعنی لوگوں کے اموال ناجائز طور پر کھانے کے لیے جو کچھ حکام کو دیا جائے وہ رشوت ہے۔''(۲)

رشوۃ کا ہم معنی لفظ ''برطیل'' ہے۔[۳] رشوت کی تعریف بسااوقات یوں بھی بیان کی جاتی ہے: ''لیث نے کہا: رشو یعنی رشوت کا فعل اور مراشاۃ یعنی ایک دوسرے کی مدد کرنا اور فیصلہ میں انصاف سے ہٹ کر مائل ہونا۔''[۴]

اصطلاحی تعریف:

بعض علماء و مفکرین کے نقطہ نظر کی رو سے: ''یعنی ہر وہ مال جو کسی کام میں کسی شخص کی مدد حاصل کرنے کی غرض سے خرچ کیا جائے۔''[۵] اس تعریف و توضیح کے ضمن میں عبداللہ بن عبدالمحسن الطریقی اپنا نظریہ مزید یوں بیان کرتے ہیں: ''رشوت لینے والے کی طلب پر جو مال بطور رشوت اسے دیا جائے، وہ رشوت کہلاتا ہے۔''[۶] بالالفاظ دیگر ثابت شدہ شرعی حق کو باطل قرار دینے یا شرعاً جو چیز باطل کے زمرے میں شامل ہے اس کو حق ثابت کرنے کے لیے جو کچھ بھی خرچ کیا جائے، وہ رشوت کہلاتا ہے۔ بعض مفکرین کا یہ کہنا ہے کہ:

> ''رشوت وہ چیز ہے جسے کوئی آدمی محض اس لیے دیتا ہے تاکہ اس کے حق میں کوئی فیصلہ صادر کیا جائے، یا کسی منصب پر فائز کر دیا جائے یا اس کی خاطر کسی انسان کی حق تلفی کی جائے۔''[۷]

ابن عابدین کے مطابق:

> ''رشوت وہ چیز ہے جو آدمی کسی حاکم یا غیر حاکم کو اس مقصد کے تحت دیتا ہے کہ فیصلہ اس کے حق میں ہو یا اس کے من پسند منصب پر اسے فائز کرے۔''[۸]

درج بالا تعریف سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رشوت غیر حاکم یا حاکم کو کسی دوسرے شخص کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ رشوت عام ہو گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مال کی صورت ہو یا کسی شخص سے حاصل ہونے والی کوئی منفعت ہو یا اس کی خاطر کسی بھی نوع کے کام کی ادائیگی ہو، یہاں حاکم سے مراد ''قاضی'' ہے جبکہ غیر حاکم سے مراد وہ شخص ہے جس سے رشوت دینے والے کا کوئی مقصد یا مفاد حاصل ہونے کی توقع ہو خواہ وہ حکمران ہو یا کسی سرکاری محکمے کا ملازم۔

گزشتہ سطور میں رشوت کے جو معنی و مطالب مذکور ہیں ان کے تنقید و تبصرے کے پیش نظر ابن عابدین کی بیان کردہ تعریف جامع اور ٹھوس ہے۔ علاوہ ازیں نقد و نظر کے ضمن میں اعتراض سے ماوراء ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں رشوت کی تعریف کچھ یوں بیان کی گئی ہے:

"A penal offence generally defined as the giving or receiving of consideration for official favour."(9)

حافظ محمد سعد اللہ اپنی کتاب بعنوان ''رشوت، ایک لعنت'' کے صفحہ ۴ پر لکھتے ہیں:

''رشوت ستانی ایک ایسا قابل مواخذہ جرم ہے جس کی عموماً یہ تعریف کی جاتی ہے کہ کسی کا کسی نوعیت کے ایسے لین دین کا مرتکب ہونا جس کا مقصد سرکاری امداد یا تعاون کا ناجائز حصول ہو۔''(۱۰)

مولانا مفتی محمد شفیع نے اپنی کتاب ''معارف القران'' میں افسر شاہی کے ضمن میں رشوت کی تعریف سہل الفاظ میں کی ہے جس کی تفہیم ہر خاص وعام کے لیے ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آسان لفظوں میں رشوت کی تعریف یوں ہو سکتی ہے کہ جس کام کا معاوضہ لینا شرعاً درست نہ ہو اس کا معاوضہ لیا جائے، مثلاً وہ کام جو کسی شخص کے فرائض میں داخل ہو اور اس کا پورا کرنا اس کے ذمہ لازم ہو، اس پر کسی فریق سے معاوضہ لینا جیسے حکومت کے افسر اور کلرک سرکاری ملازمت کی رو سے اپنے فرائض ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں وہ صاحب معاملہ سے کچھ لیں تو یہ رشوت ہے۔''(۱۱)

افسر شاہی (Bureaucracy) کے ضمن میں رشوت کی متعدد صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ رشوت سے مراد وہ رقم لی جاتی ہے جو ایک سرکاری ملازم اپنے سرکاری عہدے کی وجہ سے کسی ایسے شخص سے وصول کرتا ہے جس کا کوئی کام اس کے پاس رکا ہوا ہو۔ یوں ایک سرکاری عہدیدار دوسرے شخص کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس سے مال وزر کا متمنی ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ اس بات کا اہل نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے حوالے سے بدلے میں حکومت سے باقاعدہ اجرت وصول کرتا ہے۔ اس کے استدلال کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایک سرکاری ملازم کا اجرت وصول کرنے کے باوجود رقم یا ہدیہ لینا

خیانت کے زمرے میں آتا ہے اور خیانت اسلامی نقطہ نظر سے حرام ہے یوں وہ رقم جو بطور ہدیہ لی جاتی ہے وہ بھی حرام متصور کی جاتی ہے۔ ''عبداللہ بن عبدالمحسن'' اس حوالے سے یوں چشم کشا ہیں:

''حضرت عدی بن عمیرہ کندی سے منقول ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

لوگو! تم میں سے جو کوئی ہمارے کسی کام پر مامور ہو اور ایک دھاگہ یا اس سے بڑی کوئی چیز چھپالے تو یہ فعل خیانت ہو گا اور اسے قیامت کے دن اس کو حاضر کرنا ہو گا۔ ایک انصاری کھڑے ہوئے ان کا رنگ سیاہ تھا گویا اب بھی وہ میری نظروں میں گھوم رہے ہیں، انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ آپ مجھ سے اپنے فلاں کام کی ذمہ داری واپس لے لیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ کس لیے۔؟ انھوں نے کہا: کیونکہ میں نے سنا ہے کہ آپ نے ایسا ایسا فرمایا ہے، آپ نے فرمایا: اب بھی میں وہی کہتا ہوں کہ ہم نے جس کسی کو کسی کام پر مامور کیا اسے چاہیے کہ اس کے پاس کم یا زیادہ جو کچھ ہے واپس کر دے پھر اس میں سے اس کو جو دیا جائے اسے لے لے اور جس سے روکا جائے اس سے باز آجائے۔''(۱۲)

سرکاری عہدیداروں کو جو تحائف دیئے جاتے ہیں وہ بھی درپردہ رشوت میں شمار کیے جاتے ہیں انہیں صرف کسی بہانے اور حیلے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لہذا جس چیز کو بہانے یا آڑ کے بطور استعمال کیا جاتا ہے وہ بھی حرام متصور کی جاتی ہے۔ اس لیے جن عہدیداروں کو تحفہ اس نظریے سے دیا جاتا ہے کہ ان سے کسی بھی حرام کام کو مباح کیا جائے، تو وہ حرام ہے۔ بسا اوقات لوگ سرکاری عہدیداران سے مفاد کے حصول کے لیے اور اپنی مرضی کی خواہشات کی تکمیل کے ضمن میں انہیں قرض دے دیتے ہیں۔ اس غرض کی وجہ سے قرض کی فراہمی بھی حرام قرار دی گئی ہے۔ ان آثار و روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایسا قرض حلال شمار نہیں کیا جاتا۔ تاہم رشوت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کوئی سرکاری عہدیدار کسی بھی شخص سے رقم لے کر کسی دوسرے شخص کی حق تلفی کا مرتکب ہوتا ہے۔ رشوت کی ایک شکل یہ بھی سماج میں نظر آتی ہے سرکاری عہدیدار رقم لے کر ریاست کے ایک مجرم شہری کو بری کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ بھی جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ مثلاً ایک پولیس آفیسر کسی بھی مجرم کو مال لے کر آزاد کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے سماج، ریاست، قانون اور اپنے منصب کے ساتھ خیانت کرتا ہے۔

سماجی لحاظ سے رشوت ستانی کے جو منفی اثرات ملک پر اثر پذیر ہو رہے ہیں ان کا مکمل احاطہ کرنا یا سپرد قلم کرنا اس مختصر مقالے میں ایک انتہائی مشکل امر ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ رشوت نے ہمارے سماج کو تباہ کر دیا ہے۔ ہمارے سماج کی اکثریت دو طبقات میں منقسم ہے۔ایک طبقہ اشرافیہ اور دوسرا غریب طبقہ۔ مشاہدے میں یہ آتا ہے کہ طبقہ اشرافیہ امیر سے امیر تر ہوتا جا رہا ہے جبکہ غریب طبقہ پسماندگی کی چکی میں پستا چلا جا رہا ہے۔ امیر طبقے کا معیار زندگی بلند تر ہے۔اس کے مقابلے میں غریب طبقہ بہت پست۔ بقول ڈاکٹر سنبل نگار:

> ''مارکس کہتے ہیں کہ دنیا کے لوگ غریبوں کی غریبی کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کی محنت کی کمائی سے اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔ دولت کی یہ نابرابر تقسیم دنیا کی دوسری خرابیوں کی جڑ ہے اور اس کو مٹا دینا بہت ضروری ہے۔''(۱۳)

پاکستان کے اندر جتنے بھی اعلیٰ اور اہم مناصب ہیں ان پر طبقہ اشرافیہ کا تسلط قائم ہے۔ یہ تسلط تشکیل پاکستان سے لے کر تا حال روز افزوں بڑھتا ہی جا رہا ہے۔اس ضمن میں قیصر امین الدین لکھتے ہیں:

> ''تیز سماجی تغیرات میں بعض اوقات معاشرے میں طبقاتی تقسیم (Polarisation) پر بھی منتج ہوتے ہیں۔ یہ طبقاتی تقسیم طبقاتی کشمکش کو جنم دیتی ہے اور طبقاتی کشمکش سے معاشرتی توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔ سماجی توازن کا فقدان معاشرے میں بدعنوانیوں کو زندگی کے ہر شعبے میں سمو دیتا ہے اور ان سے سرکاری ملازمتیں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی ہیں۔''(۱۴)

امیر ہر سطح پر سرخرو رہتا ہے غریب ہر ادارہ میں رسوا پھر رہا ہے۔اس کی ایک اساسی وجہ دولت ہے جو رشوت کے طور پر پروان چڑھتی ہے۔ عام لوگوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کی کچھ سرکاری ادارے ایسے بھی ہیں کہ جہاں رشوت ستانی گناہ نہیں بلکہ ملازم کا حق تصور کی جاتی ہے۔ مثلاً افسر شاہی، کسٹم ،انکم ٹیکس وغیرہ۔ان سرکاری اداروں میں ملازمت کا حصول لوگوں کی اکثریت کا مقصد اولین ہوتا ہے کہ وہاں ناجائز آمدنی کے مواقع کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ غرض یہ کہ ہمارے سماج کے طبقاتی نظام میں جتنے بھی ادارے موجود ہیں ان میں سے اکثر رشوت کی زد میں ہیں اور اس کی شرح میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ ''مخدوم زادہ سید حسن محمود'' نے ۲۴ ستمبر ۱۹۵۳ء کو پاکستان دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''رشوت کی اصل جڑیں جرائم کی روز افزاوں افزائش،غلط مقدمے بازی، مراعات حاصل کرنے کا جنون اور سرکاری ملازمین ہیں جو زیادہ روپیہ پیدا کرنے کی حرص میں مبتلا ہیں۔(۱۵)

اچاریہ چانکیہ اپنی کتاب ''ارتھ شاستر''میں اس خیال کی توضیح یوں کرتے ہیں:

''جس طرح زبان کی نوک پر رکھے ہوئے شہد یا زہر کو بغیر چکھے چھوڑ دینا محال ہے اسی طرح کسی سرکاری ملازم کے لیے محال ہے کہ سرکاری مال کم از کم تھوڑا سا نہ چکھے۔ جس طرح پانی کے اندر مچھلی کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا ہے کہ پانی پی رہی ہے یا نہیں۔اسی طرح سرکاری افسروں کے بارے میں کہنا مشکل ہے کہ دورانِ کار میں رشوت لے رہے ہیں یا نہیں۔(۱۶)

ہمارے سماج میں رشوت ایک وبائی صورت اختیار کر چکی ہے۔اس کا معاشرے سے مکمل طور پر ختم ہونا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ معاشرے کے اندر اس وبائی مرض نے اپنی جڑیں اتنی مضبوط کر لی ہیں کہ ان کو اکھاڑ پھینکنا انتہائی ضروری ہے۔

2)۔سفارش:

ہمارے موجودہ سماج میں یوں تو بدعنوانیوں کی متعدد صورتیں ہیں جنھوں نے وبائی امراض کی شکل اختیار کر لی ہے تاہم ایک مہلک مرض سفارش ہے۔ ہمارے ملک میں بے روزگاری کے اسباب میں سے ایک سبب سفارش بھی ہے جس کی بدولت نااہل افراد نے روزگار اور اعلیٰ مراتب و مناصب کو حاصل کر لیا ہے۔یوں سماجی سطح پر اہلیت کی جگہ نااہلی نے لے لی ہے۔ سفارش کی بنا پر حقدار کا حق کسی دوسرے شخص کو دے دیا جاتا ہے یوں معاشرے میں بے یقینی کی فضا پیدا ہوتی ہے اور متعدد معاشرتی برائیاں جنم لیتی ہیں۔انسان اور سماج دونوں ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ سماجی نظام اگرچہ کسی بھی علاقے یا خطے کے تمام باشندوں پر مشمول ہوتا ہے لیکن اس کا انتظامی ڈھانچہ اور خدوخال افراد کے ان گروہوں کے ہاتھوں تشکیل پاتا ہے جنہیں سیاسی اور معاشی سطح پر اقتدار اور طاقت حاصل ہوتی ہے۔ جس بھی نوعیت کا انتظامی ڈھانچہ تشکیل دیا جاتا ہے معاشرے کے تمام انسان اس کے اصول وضوابط، نظم ونسق اور پالیسی سازی سے اکثر وبیشتر متاثر ہوتے ہیں۔ جس سماج میں معاشی

ناانصافی کا بول بالا ہو،انتظامی سطح پر کمزوریاں موجود ہوں،افراط زر کی موجودگی ہو وہاں پر اخلاقی اقدار کا وجود قائم رکھنا ایک مشکل امر قرار دیا جاتا ہے۔پاکستانی افسر شاہی میں کچھ ایسی ہی صورتحال پائی جاتی ہے۔ہمارے معاشرے میں اسلامی دعوؤں کے باوجود سفارش کا عنصر بڑھتا جارہا ہے۔یہاں پر سفارش صرف ناجائز مفاد کے حصول کے لیے ہی استعمال نہیں کی جاتی بلکہ جائز حقوق کے حصول کو ممکن بنانے کے لیے بھی ایک ضرورت بن چکی ہے۔

ترقیوں کے موجودہ نظام پر نظرثانی کرنے سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ انتظامیہ میں ترقی کے نظام میں تعلقات اور سفارش جیسے عناصر کو بے جا اہمیت حاصل ہے۔اس کے ساتھ ساتھ خویش پروری اور اقربا نوازی بھی موجود ہیں۔پاکستان اور دورِ حاضر کے کئی ترقی پذیر ممالک میں معاشی نظام کا سب سے بڑا کارفرما ادارہ انتظامیہ کو متصور کیا جاتا ہے لیکن ان ممالک میں انتظامیہ میں بدعنوانی کا عنصر اس قدر رچ بس گیا ہے سرکاری دفاتر میں اتفاقیہ طور پر وارد ہونے والا ایک عام شہری رشوت ستانی،اقرباپروری،طرفداری اور ناانصافی کا شکار ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔یہ کیفیت صرف پاکستانی معاشرے ہی کا طرہِ امتیاز خیال نہیں کی جاتی بلکہ متعدد ایشیائی ممالک بھی اس کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔مملکتِ پاکستان کی تعمیر و ترقی گزشتہ چوبیس برس میں راکھ کے ڈھیروں پر ہوئی ہے۔یہ گزشتہ چوبیس سال ملک اور عوام دونوں کے لیے بہت گراں ثابت ہوئے۔عوامی سطح پر ذلت،رسوائی،سفارش،سازش اور پریشانیوں نے قصرِ تاریک کا انتخاب کیا گیا۔پاکستان کے مقتدر طبقات نے برطانوی سامراج کی استحصالیت اور نوآبادیت کو نہ صرف دوام بخشا بلکہ اسے بامِ عروج تک پہنچایا۔بدعنوان عناصر عمومی طور پر متنوع روپ دھارتا دکھائی دیتا ہے۔بہت سے دوسرے افریقی اور ایشیائی ریاستوں کی مانند پاکستانی معاشرے کی انتظامیہ میں بدعنوانی اس قسم کے روپ دھارتی نظر آتی ہے جس میں سفارش،رشوت،اقرباپروری اور سازش وغیرہ شامل ہیں۔

سفارش کچھ ان انواع کے مشاغل کی جانب میلان کا ایک ایسا پیرائیہ اظہار ہے جو ہمارے انتظامی ڈھانچے میں معمول سا بن چکا ہے۔سفارش کے مرتکب افسرانِ اعلیٰ ہمارے سماج میں اتنے موردِ الزام نہیں ٹھہرائے جاتے کیونکہ ان میں سے اکثریت اکرام یافتہ ہوتی ہے اور وہ طبقہ اشرافیہ کی تہذیب یافتہ بستیوں میں ان کا طرزِ زیست آسودگی سے بھرپور ہوتا ہے۔بدعنوانی اور سفارش کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے ایک وقت ایسا آتا ہے جب سفارش کا مرتکب افسر اپنا کھیل سرِ عام کھیلتا ہے۔اس مقام پر پہنچ کر انسانی ضمیر اس قدر زنگ

آلود ہوتا ہے کہ افسرانِ اعلیٰ اپنی سیاہ کارئیوں کے ضمن میں خدا اور اس کے بندوں کی رائے اور نقطہ نظر سے یکسر بے نیاز ہو جاتا ہے۔اس کی زندگی کے تمام بنیادی مقاصد اس قسم کی بدعنوانیوں اور دھاندلیوں تک محدود نظر آتے ہیں۔سفارش کے حوالے سے مختلف انواع کے تلخ تاثرات مشاہدے میں آتے ہیں۔عوام الناس کا یہ خیال ہے کہ ہمارے سماج میں سرکاری دفاتر میں سفارش ابھی تک کافی مقبول چلی آرہی ہے۔مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ آوازِ خلق حقیقی معنوں میں درست جانی جاسکتی ہے یا صرف یہ ایک جذباتی مبالغہ آرائی متصور کی جاسکتی ہے؟دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ تقریباً تمام ترقی پذیر ممالک میں سفارش سے متعلق تخمینے غیر واضح ہیں۔اصل حقائق اور کوائف کمیاب دکھائی دیتے ہیں تو کیا سفارش ہماری دفتری زندگی میں ایک دائمی طرزِ زیست کا مقام حاصل کر چکی ہے؟دنیا کے اکثر و بیشتر خطوں میں عوام الناس کو یہ یقین واثق ہے کہ بدعنوانی کے حوالے سے سفارش انتظامیہ کے طرز حیات کی صورت اختیار کر چکی ہے۔اکابرین دفاتر کے ناپسندیدہ معمول کے حوالے سے عوامی مایوسی بے پناہ وسعت کی حامل بن چکی ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ لوگوں نے مجبوری کی حالت میں سفارش جیسی بدعنوانی کو روزمرہ کا ایک ناقابلِ علاج مرض اور انتہائی پریشان کن اذیت کے طور پر تسلیم کر لیا ہو۔بدعنوانی سے متعلقہ عوام کی چند آراء درج ذیل ہیں:

ا۔سفارش ہماری رگ و پے میں اس حد تک سرایت کر چکی ہے کہ ادنیٰ درجے کے سرکاری ملازم سے لے کر اعلیٰ افسران تک کسی نہ کسی صورت میں سفارش کے چکر میں ملوثّ نظر آتے ہیں۔

۲۔سفارش کے عام ہونے کی بدولت عوام کو اپنا اور اپنے اہل و عیال کا مستقبل کہیں گھٹاٹوپ اندھیروں میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

اس حوالے سے ڈاکٹر عبدالرؤف اپنی کتاب ''بدعنوانی اور رشوت ستانی'' میں رقمطراز ہیں:''عوام کا مخلص یقین ہے کہ روپیہ یا سفارش کے بغیر کسی سرکاری افسر سے کسی قسم کا کوئی کام نہیں کروایا جاسکتا۔''(۱۷)

مختلف سرکاری مشاہدات و تحقیقات اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ سفارش نے افسر شاہی کے طرزِ زیست کی صورت اختیار کر لی ہے اور یہی صورت تقریباً تمام ایشائی ممالک میں مساوی طور پر موجود ہے۔افریقی ممالک میں بھی تمام صورتحال ایسی ہی دگرگوں ہے۔سفارش جیسی بدعنوانی کی حالیہ تمام کہانیاں اپنے انوکھے اور نرالے پن کی بدولت گزشتہ تمام روایات کو شکست فاش دیتی معلوم ہوتی ہیں۔بعض لوگوں کی یہ رائے ہے کہ پاکستان میں بھی صورتحال کچھ ایسی ہی ہے۔سفارش صرف انتظامیہ کے مقتدر طبقات ہی کا وطیرہ نہیں ہے

بلکہ یہ ایک ہمہ گیر لعنت شمار کی جاتی ہے۔ جس نے انتظامی ڈھانچے کے تمام مدارج کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے لیکن یہ بھی ایک غیر مسترد حقیقت ہے کہ یہ بدعنوانی انتہائی سرعت کے ساتھ عوام کی نظروں میں آجاتی ہے۔اس کی وجہ سے طے پانے والے انفرادی نوعیت کے تمام معاملات بڑی بڑی مالیتوں کے ہوتے ہیں۔یہ اندیشہ عرصہ دراز سے محسوس کیا جاتا رہا ہے کہ پاکستان میں سفارش بہت عام ہو چکی ہے اور یہ کہ ۱۹۴۷ء سے تا حال سرکاری محکموں کی سلامتی اور انتظامی امور میں جو تنزلی ازل سے ہے اس کی شرح کے تناسب میں مزید اضافہ ہوا ہے۔اس خطرے اور خدشے کو عوام الناس کی تائید بھی حاصل ہے۔ تشکیل پاکستان سے ہی حکومت کی طرف سے سفارش اور دوسری متنوع بدعنوانیوں کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ برِصغیر پاک و ہند کے برطانوی سامراج کے وضع کردہ ''گورنمنٹ سرونٹس کنڈکٹ رولز'' کا اتباع کیا جائے گا تاہم جلد ہی یہ حقیقت سب پر آشکار ہو گئی کہ انتظامیہ کو سفارش اور بدعنوانی کی دوسری علتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے میں برطانوی سامراج کے وضع کردہ اصول و قوانین بھی کارگر ثابت نہ ہو سکے۔ سفارش نے ہماری روزمرہ زندگی کو اپنے محاصرے میں لیا ہوا ہے۔ایک آئین کے مطابق سفارش ہمارے سماج میں رچ بس گئی ہے۔اس کے تدارک کے لیے ہمیں ان تمام تر طریقہ ہائے کار کی نسبت ٹھوس اور انقلابی نوعیت کے اقدامات کی اشد ضرورت ہے جنہیں ہم گزشتہ عہد میں اختیار کر چکے ہیں۔ایک دفعہ رومن ایمپائر کی بابت ''والٹیر'' نے یہ تک کہا تھا کہ یہ نہ رومن ہے، نہ ہی مقدس اور نہ ہی سلطنت ہے۔ کچھ اسی قسم کے تاثرات پاکستانی عوام کے ہماری انتظامیہ کے متعلق بھی ہیں اور کچھ حد تک یہ درست بھی ثابت ہوتے ہیں۔ والٹیر کے اس نقطہ نظر کی توثیق میں ڈاکٹر عبدالرؤف لکھتے ہیں کہ: ''پاکستان کا سول ملازم نہ تو سول ہے، نہ ملازم ہے اور نہ ہی صحیح معنوں میں پاکستانی۔''(۱۸)

پاکستانی افسر شاہی کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ خصوصی طور پر ان عوامل کی روشنی میں جنہیں گزشتہ ایک عشرہ کے دوران ہمارے معاشی نظام کے تمام طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے دیکھا، سنا اور محسوس کیا۔ ملک کی بدلتی ہوئی متعدد حالتوں اور اس کے عروج و زوال میں سرکاری ملازمین کا کردار اتنا اہم رہا کہ اس کی توضیح و تشریح کی ضرورت قطعی نہیں ہے۔ آزادی کے حصول کے بعد نوزایئدہ مملکت میں مختلف انواع کی چھوٹی بڑی اور سیاسی تبدیلیاں تو ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں لیکن افسر شاہی ان تمام آمرانہ اور شاہانہ طرزِ زندگی پر قائم و دائم رہی جو اس نے ازمنہ ماقبل میں برطانوی سامراج سے سیکھے۔

سفارش کا واقعیت پر مبنی مطالعہ معلومات میں اضافے کا باعث ہو سکتا ہے۔ جدید دور میں عوام الناس

کے بنیادی مسائلِ حوائج کو نہایت جرات کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔کچھ شعبہ ہائے زندگی میں عوام کی فلاح و بہبود کے مختلف منصوبوں پر کام کا آغاز کیا گیا ہے۔ان تمام حالات میں ہر آدمی جو جبلی طور پر حساس ہو وہ اس غور و فکر میں سر گرداں دکھائی دیتا ہے کہ کیا عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ان مجوزہ منصوبوں کی کامیابی اور تکمیل ممکن ہے ؟اس کے ساتھ ساتھ اس طرح کے خیالات بھی انسان کے ذہن میں جنم لیتے ہیں کہ :

۱۔کیا افسر شاہی کی خرابی کی بنیادی وجہ سفارش ہے ؟

۲۔اس کی اصلاح کیونکر ممکن ہے ؟

۳۔ گزشتہ عہد میں ہم سفارش کا قلع قمع کرنے میں ناکام کیوں ہوئے ؟

۴۔ مستقبل میں ماضی کی ان کوتاہیوں سے کیسے سبق سیکھا جاسکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ایک دفعہ جب اس قسم کے احتسابی عمل کا آغاز ہو جائے تو چند بنیادی سوالات ہر بار پھر ضمیر کو ستاتے محسوس ہوتے ہیں۔جب کسی بھی قوم کے عوام اپنے ضمیر سے اس طرح دست و گریباں ہو جائیں تو سفارش اور دیگر بد عنوانیاں گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو جاتی ہیں اور قومی معاشی و معاشرتی زندگی کا یہ کارواں ترقی و منزلت کی طرف جادہ وپیما ہو جاتا ہے۔ایک سوال یہ بھی انسانی ذہن کو ستاتا ہے کہ کہیں ہماری افسر شاہی نے کلیپٹو کریسانہ شکل تو اختیار نہیں کی ؟ہر محب وطن شہری کو یہ سوالات جواب کی کھوج کی جانب مائل کرتے ہیں۔ کلیپٹو کریسی کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ ایک ایسا سماج جو بد عنوانیوں پر مشمول ہے اور جس میں بد عنوان افراد ہی حاکم دکھائی دیتے ہوں اور اس میں کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہو وہ بد عنوانیوں اور سفارش کے لیے ہی ہو۔اگر ہم اپنے گرد و نواع میں ایک ناقدانہ نظر دوڑائیں تو ہمیں چہار سو ''کلیپٹو کریسی'' ہی سر گرم عمل دکھائی دیتی ہے۔اس اصطلاح کا لب لباب کچھ یوں ہے حکومت اور اقتدار تمام ذریعوں پر اصول و ضوابط کی کارفرمائی کی بجائے ضرورت اور دستیابی کے ناپسندیدہ عوامل جیسے سفارش،اقربا پروری اور رشوت کو غالب کر دیا جائے۔ایک کلیپٹو کریسانہ مملکت کا نظام ان اختیارات پر مبنی ہے کہ اس کی انتظامیہ بظاہر اشتراک زدہ ہوتے ہوئے بھی مقتدر طبقاتی نظام کا ایک عجیب و غریب نمونہ ظاہر کرتی ہے۔سفارش اور اس کی صورتوں سے متعلق م ب خالد قدرت اللہ شہاب کے مضمون ''ایوانِ صدر میں میرا آخری دن'' میں ان کے الفاظ کو کچھ یوں بیان

کرتے ہیں: ''سفارش کا دوسرا نام اقربا پروری ہے اور یہ جرم ہے۔ بالخصوص اگر کسی دوسرے حق دار کو اس کے جائز حق سے محروم رکھنے کا باعث ہو۔''(۱۹)

3)۔اقربا پروری:

جوں جوں سماج نے ترقی کی تو ترقی یافتہ معاشروں میں گروہی، ذات پات یا قبائلی بندھنوں کی جگہ سیاسی اداروں نے لے لی۔ بد قسمتی سے ملک پاکستان میں بھی سیاسی عمل کا تسلسل برقرار نہ رہ سکا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسانوں نے چونکہ جبلی طور پر اپنے آپ کو اجتماعی اداروں کے ساتھ منسلک رکھنا تھا اس لیے وہ سیاسی جماعتوں سے خود کو منسلک رکھنے کی بجائے ذاتوں اور چھوٹی قومیتوں کے بھنور میں پھنس کر رہ گئے۔ سیاسی جماعتیں قومی سطح پر کوئی بھی مفید کردار ادا کرنے کے ضمن میں بار آور ثابت نہ ہوئیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم ذاتوں اور قبائلی اداروں کی طرف واپس پلٹنے لگے۔ ان دو عوامل نے ہم پر اس قدر دباؤ ڈالا اور اس قدر مطالبات کئے گئے کہ ہم ان فرائض منصبی سے بھی منحرف ہو گئے جو ملک و قوم کی طرف سے ہم پر عائد کئے گئے تھے۔ نتیجتاً اقربا پروری سرکاری ملازمتوں میں در آئی۔ قومی سطح پر کئی دائرے نمودار ہوئے۔ یہ دائرے سرکاری ملازمتوں پر حاوی ہو گئے۔ ابتدائی سطح پر سندھیوں، پنجابیوں، پٹھانوں، بنگالیوں اور بلوچیوں کا تذکرہ کیا گیا۔ بعد ازاں ان کے اندر قبائل اور چھوٹی بڑی ذاتوں کے دائروں نے جنم لیا۔ یہ دائرے اپنے اپنے محور کے گرد محو چکر ہیں لیکن چونکہ یہ مصنوعی نوعیت کے حامل تھے۔ اس لئے ان میں کائناتی نظم و نسق کا فقدان تھا، باہمی روابط کی بھی کمی تھی۔ اس لئے جلد ہی ان کا باہمی تصادم ہونے لگا۔ یہاں بات کی طوالت کے پیش نظر یہ سمجھانا مقصود تھا کہ قوم نے سرکاری ملازمتوں میں وہی کچھ منتقل کر دیا جو کہ بنیادی طور پر اس کی اپنی ذات کا حصہ نہ تھا۔ اقربا پروری نے زور پکڑا اور پروان چڑھی۔ اس کے ساتھ ساتھ رشوت نے بھی اپنے پاؤں گاڑنے شروع کر دیئے۔

عہد حاضر کے سماج کو جن آفات اور قباحتوں نے کھوکھلا اور زہر آلود کیا ہے ان میں سے سب سے زیادہ قابل مذمت اور قبیح ''اقربا پروری'' ہے۔ انسانی معاشرے میں اقربا پروری کے بطن سے نااہلی اور ناانصافی کے کانٹے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ گزشتہ کئی صدیوں سے اقربا پروری میں جکڑا ہوا ہے۔ اہلیت، ذہانت، محنت اور قابلیت اپنی توہین اور تحقیر پر خون کے آنسو بہا رہی ہیں۔ اپنے اقربا کو نواز نا روز اول سے انسانی سرشت میں شامل ہے لیکن اگر اس میں ناانصافی کی شمولیت ہو جائے تو یہ بد یانتی کے زمرے میں آتی

ہے۔دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی معاشرتی سطح پر انسان اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔وہاں بھی دوستی،قرابتداری اور جان پہچان انسانیت سے دامن گیر ہیں۔تاہم دیانت اور انصاف اس سے دامن چھڑا کر ''فئیر پلے'' کی روایت کو برقرار رکھتے ہیں۔اگر مختلف شعبہ ہائے زندگی میں معیار اور اہلیت کے حامل اشخاص کا تقابل اقربا پروری اور سفارش کے حامل افراد سے کیا جائے تو تمام تر حقیقت سب پر عیاں ہو جاتی ہے۔اقربا پروری کا سب سے سنگین رد عمل ''محرومی'' کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔جب قابل،ذہین اور مستحق افراد کی حق تلفی کی جاتی ہے اور ان پر روزگار کے مواقع بند کر دیے جاتے ہیں تو احساسِ محرومی اور مجبوری انہیں سماجی سطح پر ملک کے قوانین و ضوابط سے بغاوت پر اکساتے ہیں۔جو کسی بھی قوم کے لئے معاشرتی سطح پر ''سمِ قاتل'' ثابت ہوتے ہیں۔ہمارے تمام اربابِ اختیار اور محافظوں کے لئے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔دور حاضر میں چہار سو جو ناامیدی اور بے حسی نے پاؤں جما لئے ہیں ان کا سب سے بڑا محرک اقربا پروری کو گردانا جاتا ہے۔جب سے اقربا پروری اور سفارش کا عفریت اپنا وجود ختم نہیں کرتا تب تک معاشرے سے محرومی اور بے یقینی کی کیفیت ختم نہیں ہو سکتی۔انسانی حقوق کے تحفظ کے ضمن میں عالمی اعلامیے کے مطابق ہر شخص کو مساوی شرائط میں اپنے وطن میں عوامی کاموں تک رسائی حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔یہی وجہ ہے کہ اقربا پروری عوام الناس کے سرکاری کاموں میں منصفانہ اور مساوی طور پر عوامی کاموں تک رسائی کے حق کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

عموماً ایک اصول اقربا پروری کے ساتھ میل کھاتا نظر آتا ہے۔وہ ''توفیق پسندی'' ہے لیکن اقربا پروری میں مفاد حاصل کرنے والے کے ساتھ اس کی دوستی یا خاندانی رشتہ ہوتا ہے۔ابتدائی طور پر لفظ ''اقربا پروری'' پوپ کے بھانجے کے لیے مستعمل تھا۔چونکہ اس کی سرپرستی پوپ کرتے تھے اور پوپ نے اسے اپنے بچوں کی طرح پالا تھا،تاہم ان میں سے کچھ کو ''کارڈنل'' کے نام سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔اب سے قرنوں پہلے اقربا پروری کی جھلک ہر عہد میں نظر آتی ہے۔اس کی ایک روشن مثال رومن سلطنت میں موجود ہے۔جب '' پومپیو '' نے '' اسکوائیو'' کو بغیر کسی تعلیم و تربیت کے دو فوجی یونٹوں کا نگرانِ اعلیٰ نامزد کیا تھا۔نپولین بوناپارٹ کے مینڈیٹ کے دوران فرانس میں بھی کچھ ایسے ہی شواہد نظر آتے ہیں۔اقربا پروری کی تعریف کچھ یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ سرکاری عہدے پر منصب کچھ فعال ملازمین مراعات کی عنایت کے وقت یا ریاستی ملازمین کی نوازشات کے حصول کے وقت اپنے کنبے،رشتہ داروں اور دوست احباب سے امتیاز برتتے ہیں۔اس ضمن میں جو شخص عوامی ملازمت حاصل کرتا ہے وہ اپنی قابلیت اور اہلیت کے ذریعے نہیں بلکہ مقاصد

کے حصول یاافسر سے وفاداری کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔تاہم اقرباپروری کو بدعنوانی کا ایک پہلو گردانا جاتا ہے۔سماجی حوالے سے یہ قابل قبول نہیں کہ ایک افسر یا سیاسی رہنما ہمدردی پیار کی بدولت کسی رشتے دار یا دوست احباب کو عوامی وسائل کی سپردگی دے یاوسائل مختص کردیے۔

نیپٹزم یااقرباپروری کی تاریخ گزشتہ ایک ہزار سال پر محیط ہے۔عمومی طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ قدیم یونانی نیپوس(ہسپانوی میں ''بھانجا''ترجمہ کیا گیا)بالالفاظ دیگر رومن شہنشاہ جولیو نیپوت سے اخذ شدہ ہے۔عہد رومن میں ''اقربا پروری''کا ایک واقعہ پیش ہوا جس میں پومپیو نے اپنے داماد''میٹیلس اسکیپیو''(فوجی محکمے میں نااہلی کی علامت تھی)کو اہم ذمہ داریاں تفویض کیں تاہم ''مارکوانتونیو''نے سینیٹ کے روبرو اس کی بھرپور مذمت کی۔اقرباپروری کے ایک اور واقعے کے شواہد بھی تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں کہ جب نپولین بوناپارٹ کے توسط سے ایک معاملہ انجام پذیر ہوا۔اس فرانسیسی رہنمانے شرط کے طور پر کچھ عہدے عطا کئے۔اس میں سب سے مشہور اپنے بھائی''جوس بوناپارٹ''کو دیا گیا عہدہ تھا۔

دورِ حاضر میں ہمیں وہ شخصیات بھی نظر آتی ہیں جن پر''اقرباپروری''کاالزام ہے اور وہ اپنے دفاع کی کوششوں میں مصروف عمل ہیں۔مثال کے طور پر پیراگوئے کے صدر''فیڈریکو فرانکو''کا حالیہ واقعہ ہے۔جنھوں نے اپنے دورانِ مینڈیٹ خاندان کے ۲۷ افراد کو مختلف عہدوں پر مامور کیا جو کہ اپنے آپ کو بڑی ذمہ داری کے عوامی عہدوں پر قابض خیال کرتے ہیں۔اسی حوالے سے ایک اور واقعہ ناقابل فراموش ہے جو کہ حال ہی میں میکسیکو میں پیش آیا جس میں''جوزفیناواز کوز موٹا''پر اقرباپروری کاالزام لگایا گیا کیونکہ اس نے اپنی حقیقی بہن''مارگریٹا سلویہ''کو خواتین پر تشدد کے جرائم کے خلاف خصوصی پراسیکیوٹر کے دفتر میں ایک اہم عہدہ تفویض کیا حالانکہ اس کی بہن کے پاس ضروری قابلیت واہلیت نہ ہونے کے برابر تھی۔

رواں صدی میں''اقرباپروری''کا لفظ عوامی خدمت کے حوالے سے دوستوں،رشتہ داروں یا جاننے والوں کو ملازمت دینے کی ترجیح کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔حقیقتاًاقرباپروری اس وقت وقوع پذیر ہوتی ہے جب کوئی سرکاری عہدیدار صرف اور صرف رشتے کی بناپر مراعات فراہم کرتا ہے۔ڈاکٹر عبدالرؤف لکھتے ہیں:

> طرفداری،خویش پروری،اقربانوازی اور ان علتوں سے متعلق دیگر قباحتوں کی سرکاری قواعد و ضوابط میں حسبِ منشاء چھوٹے موٹے تفرقات اور''اختیارات''کاارتکاب ہماری دفتری زندگی کا خاصہ بن چکا ہے۔''(۲۰)

اقربا پروری کا ارتکاب کرنے والے سرکاری افسران اصول وضوابط میں مخفی قسم کی مجرمانہ تغیر و تبدل اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے اہل وعیال، عزیز واقارب اور دوست احباب ان کی ملازمت سے فائدہ حاصل کر سکیں۔ ہمارے معاشرے میں اس خفیف قسم کی بدعنوانی کو اس لیے اتنا معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے تاکہ جب گردونواع کے سارے ماحول میں مقتدر طبقات لمبی سودے بازی میں ملوّث نظر آتے ہیں تو ایک افسر اگر عزیزو اقارب کی روزمرہ کی بنیاد پر پیش آنے والی پریشانیوں کو ختم کرنے کے لیے اگر اس طرح کی کرم فرمائی کی جانب مائل ہو بھی جائے تو عوام الناس اسے اکثر و بیشتر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسے ثالثی درجے کی بدعنوانی شمار کیا جاتا ہے۔ جس وقت جس نظام میں اقربا پروری یا خویش پروری آجاتی ہے تو وہ نظام تباہی کی طرف سفر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے سماجی نظام میں جب بھی کسی کو کوئی عہدہ مل جاتا ہے تو اس کی حتی الوسع کوشش ہوتی ہے کہ اس کے ماتحت اس کے قریبی اور ہم خیال لوگ ہی ہوں تاکہ اس کا عہدہ دیرپا رہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قابل اور ذہین افراد کی جگہ معاشرے میں نااہلی اور نالائقی اپنے قدم جما لیتی ہے۔

4)۔ سازش:

لفظ ''سازش'' کے لفظی معنی ''خفیہ تدبیر یا کاروائی، گٹھ جوڑ، میل ملاپ، میل جول'' کے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں کسی برے یا غیر شرعی مقاصد کے حصول کے لیے دو یا دو سے زیادہ افراد میں باہمی ارتباط کو سازش کہتے ہیں۔ اس کے مترادفات میں ''اسکیم، اتفاق، ارتباط، ربط اور ملاپ'' وغیرہ مستعمل ہیں۔

قائدِ اعظم محمد علی جناح کی قیادت اور مدبرانہ سربراہی میں مسلم لیگ نے جس مملکت کے لیے تگ ودو کی اور نتیجے میں ایسا ملک تخلیق کیا جس کا پہلے کہیں بھی وجود نہیں تھا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح کی سیاسی اور قومی بصیرت نے انگریزوں اور ہندوؤں کی پسِ پردہ اور کھلی سازشوں کا قلع قمع کیا اور اس خطہ زمین پر مسلمانوں کے لیے جداگانہ مملکت کا وجود یقینی بنا۔ اس کی تشکیل کے پیچھے بہت سے مقاصد کارفرما تھے کہ یہ ملک مسلمانوں کے لیے ایک ایسا نمونہ ہوگا جس کا انتظام وانصرام جمہوریت اور جمہوری اداروں کے پاس ہوگا۔ اس میں تمام مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو اقتصادی اور سماجی حقوق مساوی طور پر حاصل ہوں گے۔ کسی کے ساتھ کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا لیکن یہ ملک اور عوام کی بدقسمتی ہے کہ آغاز ہی سے افسر شاہی، فوج اور جاگیرداروں نے ایک تثلیث کی شکل اختیار کر لی کہ جو اختیار اور اقتدار پر قبضہ حاصل کرنے کے متمنی تھے۔ چنانچہ آئین کی تشکیل اور جمہوری نظام کی بنیادیں کھوکھلی ہو کر رہ گئیں۔ سازش کی بنیاد پر سیاسی انتشار کو

پھیلایا گیا۔ حکومتیں گرتی رہیں اور بنتی رہیں۔ بالآخر فوجی اقتدار نے اپنا قبضہ جما لیا۔ پاکستان کی سیاسی صورتحال اور افسر شاہی کی بدولت عوام اس طرح کے مسائل اور بے یقینی کی کیفیت سے دوچار رہے اور ملکی سیاست میں حکومتوں کا بننا اور برطرف ہونا ان الجھنوں اور تضادات کی نشاندہی کرتا ہے جن کا پاکستان میں یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتیں شکار رہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں اقتدار کے منبع (Locus of power) اور اقتدار کے آئینی اور قانونی جواز (Legitimation of power) میں آغاز ہی سے باہمی چپقلش اور مسلسل تناؤ کی کیفیت طاری رہی۔ اس مقالے میں جس بنیادی نکتے پر توجہ کو مرکوز کیا گیا ہے اس کا لب لباب یہی ہے کہ پاکستانی معاشرے میں ریاست کا اقتدار فوج اور بیوروکریسی پر مشتمل اتحاد کے قبضے میں ہے۔ ریاستی اقتدار پر قابض یہ طبقہ باہمی سازش کے ذریعے نہایت ہی مربوط گروہ کی صورت میں منظم ہیں۔ فوج اور افسر شاہی کے اس گٹھ جوڑ کو صرف ایک ہی جانب سے خطرہ درپیش ہے اور وہ ہیں علاقائی تحریکیں اور نسلی بنیادوں پر کی جانے والی سیاست۔ اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں کہ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی بھی اس سازش اور گٹھ جوڑ کی طاقت کو کمزور کرنے میں ناکام رہی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے پاکستان کی سیاسی قیادت آئین اور قانونی ضوابط میں جکڑی ہوئی ہے جس کی بدولت وہ فوج اور افسر شاہی کے اس گٹھ جوڑ کو ختم کرنے کے لیے کسی بھی متبادل قوت کو متحرک کرنے اور منظم کرنے میں کامیاب نہیں رہی۔ مزید یہ کہ ریاستی معاملات پر تسلط رکھنے والے عناصر (فوج اور بیوروکریسی) ان پر آسانی سے اپنی بالادستی کو قائم کر لیتے ہیں اور جلد ہی یہ طبقات ان مقتدر طبقات کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر رہ جاتے ہیں۔ ریاستی اقتدار اور اس کے اداروں کی ہیت میں تبدیلی یہاں تک کہ انتخابی عمل کی جانب رجوع فوج اور افسر شاہی کے مضبوط گٹھ جوڑ پر اس لیے لاگو کیا جاتا ہے کہ ریاستی اقتدار پر ان کے تسلط کو بہتر جواز میسر آسکے۔ کیونکہ محض جبر واستبداد کی ہی بدولت ریاست پر اپنا کنٹرول برقرار رکھنا ناممکن ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فوج اور افسر شاہی کی جانب سے 'جواز' کی یہ تلاش محض ایک سازش ہے۔ بعض حکومتوں کی جانب سے فوج اور افسر شاہی کے اس باہمی گٹھ جوڑ کو سیاسی قیادت کے تابع لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آغاز ہی سے سماج اور ریاست میں فوج اور افسر شاہی کے غاصبانہ تسلط کو تسلیم کر لینے سے کئی نظری سوالات نے جنم لیا:

۱۔ کیا یہ ایک ایسا ادارہ (فوج اور افسر شاہی) ہے جو سماج سے بالاتر اور اپنا ایک جداگانہ تشخص رکھتا ہے؟

۲۔ کیا اس ادارے نے ریاست اور سماج کو اپنے مذموم مقاصد کے تابع کر رکھا ہے۔ اگر اس کا جواب ہاں

میں ہے تو وہ کون سے مقاصد ہیں جنہیں پایہ تکمیل تک پہنچانے کا وہ خواہاں ہے۔

غیر مارکسی نظریات کے مطابق ریاست کے تصور کو دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے سیاسی عمل کے ایک وسیع نوعیت کے ماڈل کے ایک ذیلی حصے کے طور پر قبول کیا گیا ہے لیکن حالیہ چند برسوں میں ریاست کا تصور اپنی ایک الگ حیثیت میں پھر سے مسلم حیثیت اختیار کر چکا ہے۔مارکسی نظریے کے مطابق ایک ایسی ریاست کو مقبولیت حاصل ہے جو بنیادی طور پر معاشرے سے وابستہ ہو لیکن اس ضمن میں کئی مسائل سامنے آئے۔جب ریاست کے تصور کے حالیہ Versions کو ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کے ریاستی تجربات کی روشنی میں تشکیل دیا جاتا ہے۔جس میں معاشی طور پر ایک غالب طبقے کی حکمرانی کی مثالیں ہیں۔عصرِ حاضر میں مارکسی نظریہ ریاست کے دونوں متبادلات یعنی انسٹرومینٹلسٹ (آلہ کار) تصور ریاست جس میں ایک مقتدر طبقے کو شفاف قرار دیتے ہوئے ریاست کو اس طبقے کا آلہ کار بنایا جاتا ہے جبکہ ساختیاتی(Structuralist) تصور میں ریاست کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ایسے حالات کو پیدا کر دے کہ ایک ہی حکمران طبقے کے مذموم مقاصد اور مفادات کا حصول ممکن ہو سکے۔مارکسی نظریہ ریاست کے مطابق پاکستان جیسی مابعد نو آبادیاتی ریاست میں معاشی طور پر غالب طبقات میں سے کسی کو بھی ''حکمران طبقہ'' نہیں کہا جا سکتا اور ملک میں فوج اور افسر شاہی کے باہمی گٹھ جوڑ کے فعال کردار پر نظر ثانی کی جائے تو یہ عمومی تاثر جنم لیتا ہے کہ یہ گٹھ جوڑ اور ریاست سماج میں تمام تر طبقات سے بالاتر اور آزاد ہیں لیکن سرمایہ دارانہ نظام بھی ضروری خیال کیا جاتا ہے۔فوج اور افسر شاہی اس کے مفادات کی تکمیل کرتے ہیں۔بہت سے لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ پاکستان میں ابتدائی گیارہ سالوں میں جمہوری قیادت کی حکمرانی رہی اور سیاسی اقتدار سیاستدانوں کے پاس تھا۔پاکستان کے ریاستی امور میں افسر شاہی کی مرکزی حیثیت کو ۱۹۶۰ء کی دہائی کے وسط میں تسلیم کیا گیا۔تاہم بعض جگہ یہ بات بھی مشاہدے میں آتی ہے کہ آغاز سے ہی افسر شاہی نے مرکز میں مقتدر حیثیت حاصل کر لی تھی۔حقیقت یہ ہے کہ یہ فوج اور افسر شاہی کا گٹھ جوڑ (Oligarely) تھا جو کہ مرکزی حکومت پر قبضہ قائم کیے ہوئے تھا۔آغاز میں فوج اس گٹھ جوڑ میں کم حصہ دار تھی۔البتہ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں فوج کے اثر رسوخ میں اضافہ ہوا۔یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ پاکستانی معاشرے میں افسر شاہی بالکل ویسا ہی برتاؤ کرتی ہے جو نو آبادیاتی عہد میں ان کا طرہ امتیاز تھا جس میں ریاستی پالیسی کے ضمن میں بنیادی مسائل اور حکمت عملیوں کے تعین میں مقامی افسروں کا زیادہ عمل دخل نہیں تھا۔مابعد نو آبادیاتی صورتحال میں بھی کافی حد تک یہی انداز اپنایا گیا جس سے ریاستی پالیسی کی تشکیل میں برے

اثرات مرتب ہوئے۔ جیسا کہ درج بالا سطور میں تذکرہ کیا جا چکا ہے پاکستان میں شروع سے ہی ریاستی اقتدار افسر شاہی کے ہاتھوں میں تھا جبکہ پاکستانی سیاسی قیادت کی اقتدار کے ریاستی ڈھانچے میں حیثیت ثانوی تھی اور فوج اس وقت غیر منظم اور کمزور تھی۔ بعد ازاں پاکستان میں کئی اس نوعیت کی تبدیلیاں لائی گئیں کہ ان تبدیلیوں نے افسر شاہی کو ایسے مواقع فراہم کیے کہ جن کی بنیاد پر ان کے تسلط کو مزید استحکام ملا۔ سول سرونٹ کے کردار اور سیاستدانوں کے ساتھ اس کے سلوک کی جو روایت نوآبادیاتی عہد میں شروع ہو کر جس حد تک پختہ ہوئی تھی پاکستانی بیوروکریسی اس کی امین نظر آتی ہے۔ نوآبادیاتی عہد کی طرح قیام پاکستان کے بعد بھی سول بیوروکریسی سے متعلق افسران سیاستدانوں کو درخور اعتنانہ سمجھتے ہوئے ان کے ہر حکم کی روگردانی کی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فوج اور افسر شاہی کی طاقت اتنی تھی کہ اس دور کے وزراء کچھ کرنے پر قادر نہ تھے۔ تمام مقتدر عناصر اپنی اپنی سازشوں کے بل بوتے پر اپنے مفادات کے حصول کو ممکن بناتے رہے جبکہ عوام کے مسائل جوں کے توں رہے۔

معاصر اردو ناول میں ان بدعنوانیوں کی عکاسی کا مطالعہ

اگر تاریخی نقطہ نظر سے مملکت پاکستان میں بدعنوانی کو زیر جائزہ لایا جائے تو پاکستان میں کرپشن، فوجی شاہی، طبقاتی نظام اور افسر شاہی برطانوی نوآبادیاتی عہد کی پیداوار ہیں۔ عصر حاضر میں بھی ان کی باقیات بامِ عروج تک پہنچ چکی ہیں۔ ان تمام کا گٹھ جوڑ ملک کے تمام شعبوں پر اپنا تسلط قائم کیے ہوئے ہے۔ رشوت کے حوالے سے افسر شاہی کا جائزہ لیا جائے تو رشوت نچلی سطح سے اوپر والی سطح تک اکٹھی کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں بعض اداروں میں رشوت اوپر سے نیچے کی سطح تک منقسم ہوتی نظر آتی ہے۔ برِصغیر پاک و ہند کی تقسیم (۱۹۴۷ء) میں نوزائیدہ مملکت پاکستان کو چلانے کے لئے ایک انتظامی نظام حکومت برطانیہ کی جانب سے وراثت کے طور پر ملا۔ سابقہ بھارتی سول بیوروکریسی کے ڈھانچے سے اخذ شدہ یہ ادارہ نوآبادیاتی عہد کی تنگ ذہنیت، مفاد پرستی اور برتری و حاکمیت کی جھلک ہے۔ ہمارے معاشرے میں رشوت بدعنوانی کی ایسی صورت ہے جس نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ کسی بھی فرد میں رشوت ستانی کا جواز و حوصلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب بحیثیت مجموعی سماج میں بدعنوانی یا کرپشن کا بول بالا ہو۔ ہمارے ہاں رشوت کا آغاز اعلیٰ طبقات سے ہوا۔ اس کا اساسی پہلو افسر شاہی کو فائدہ یا نقصان پہچانے کا قانونی اختیار تھا۔ یہ اختیار اس وقت کرپشن

کا سبب بنتا ہے جب مجموعی طور پر معاشی نظام غیر منصفانہ ہو اور اس اختیار کی بدولت سرکاری اہلکار کسی کاروباری فرد کو نفع دینے کا ذریعہ ثابت ہو سکے۔

اس پہلو کا ذکر خالد فتح محمد نے تاریخی اعتبار سے بھرپور طریقے سے ناول 'پری' میں سمویا ہے۔ اپنی بنت کو حوالے سے 'پری' کا ابتدائی حصہ دوسرے حصوں کی نسبت زیادہ مستحکم، مضبوط اور مربوط نظر آتا ہے۔ اس حصے کا سارا بیانیہ مرکزی کردار کی ''میں'' پر مشتمل ہے۔ واحد متکلم کے بیان کار سے کردار کی خود اعتمادی اور ہنر مندی کا اظہار ہوتا ہے ناول ہذا کے تمام حصے ماسوائے آخری کے واحد غائب کے بیانیے پر مشتمل ہیں۔ تاہم اس کہانی کے تار و پود میں بدعنوانی کے محرکات، اثرات اور دیگر تاریخی نوعیت کے مباحث مسخ نہیں ہونے پاتے۔ یہاں پر ناول نگار کی اپنے نقطہ نظر اور اپنے موضوع پر کامل گرفت کا اظہار ہوتا ہے۔ جس کی بھرپور عکاسی اکیسویں صدی کے ناولوں میں موجود ہے۔ خالد فتح محمد بیوروکریسی اور ملکی سیاست پر گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے زیر تحقیق ناول ''پری'' میں مختلف فرضی کرداروں کی صورت میں ملک کی صنعتی ترقی، بیوروکریسی، ملکی حکومت اور جمہوریت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ متذکرہ ناول کے بارے میں نطاشہ مسعود اپنے مقالے میں یوں تذکرہ کرتی ہیں:

> ''''پری' ناول کوئی سماجی اصلاح کا مقصد نہیں رکھتا نہ ہی ناول نگار سماج کی خرابیوں کو اجاگر کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ یہ ایک خاص صورت حال میں جکڑے ہوئے فرد کا اظہار ہے۔ اس ناول کے دوسرے باب میں ہماری ملکی سیاست پر عہد بہ عہد نظر ڈالی گئی ہے اور ہماری سیاست کا یہ پہلو بہت افسوس ناک ہے۔ ہمارے ملک میں حکومتیں کیسے بنتی اور ٹوٹتی ہیں۔ اس کی عکاسی بھی اس ناول میں کی گئی ہے۔ ہماری فوجی اور سول بیوروکریسی کا ملک کی سیاسی تنزلی میں بڑا ہاتھ ہے۔''(۲۱)

مذکورہ ناول ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم افسر شاہی کی قباحتوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ خالد فتح محمد نے 'پری' لکھ کر یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ ہم انتشار اور عدم استحکام کے عہد میں سانس لے رہے ہیں۔ مقتدر طبقات کا یہ تاثر عام ہے کہ غیر معمولی اثر و رسوخ کی حامل مقتدر قوتیں نہ صرف ہم سب پر حاوی ہیں بلکہ معاشرے میں انتشار اور خلفشار کو پیدا کرنے میں اپنی محوریت اور مقصدیت میں کامیاب ہیں۔ خالد فتح محمد نے حالات اور وقت کے اسی منظر کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے۔ اس ناول میں جہاں ایک طرف سیاسی نظام اور

سیاسی جماعتوں کی خود غرضی کا پردہ چاک کیا ہے وہیں افسر شاہی کی کوتاہیوں اور عوامی استحصال کا پردہ چاک کیا ہے۔ خالد فتح محمد کی سیاسی بصیرت اپنے معاصرین میں یقیناً قابل تعریف ہے۔ ان کی نظر میں پورے پاکستان کے انتظامی نظام کے حالات ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کرداروں کی شکل میں اس ناول میں واضح کر دیا ہے کہ اب کسی ایک جماعت کی حکومت قائم ہونا مشکل بات ہے۔ اب گٹھ جوڑ کی سیاست ہی حکومت کرے گی۔ ہر چھوٹی بڑی جماعت ملکی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر صرف اور صرف اپنے ذاتی مفادات کو اولین ترجیح دے گی۔ اس کا اثر عام آدمی پر بھی پڑے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ پیشہ وارانہ ڈگریاں حاصل کرنے والے اعلیٰ عہدیداران بھی سیاست کی انگلی تھام کر اقتدار کو حاصل کرنے کے خواہاں ہیں۔ وہ شہرت، ناموری اور اقتدار و دولت کی حرص و ہوس کا شکار ہو رہے ہیں۔ ناول میں افسر شاہی میں رشوت ستانی کے پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے جس سے نہ صرف ناول نگار کی عصری آگہی کا ثبوت ملتا ہے بلکہ اپنی بصیرتوں کی بدولت افسر شاہی کی ذہنیت کا بھی اندازہ کر لیا تھا۔ جس میں سے ایک پہلو رشوت ستانی بھی ہے۔ اگر قانون کا نفاذ کرنے والے افراد اور اس کے محافظ ہی قانون شکنی کا مرتکب ہو کر رشوت لینا شروع کر دیں تو ایسے سماج میں نہ تو کسی کی جان و مال محفوظ ہے اور نہ ہی عزت و آبرو۔ عمال، افسرانِ بالا اور حکومت کے دیگر ذمہ دار افراد اگر کھلے عام رشوت لینا شروع کر دیں تو رفتہ رفتہ اختیارات کے غلط استعمال کا رجحان بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حکومت کسی عہدے پر فائز افراد اور مامور اشخاص 'امین' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر وہ عہدے یا اختیارات کا غلط استعمال کریں گے تو خائن شمار کیے جائیں گے۔ رشوت کی بدولت ایک طبقہ ظالم اور دوسرا مظلوم خیال کیا جاتا ہے۔ جو لوگ رشوت ادا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں وہ اپنے جائز حقوق سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ زیرِ تحقیق ناول میں بھی خالد فتح محمد نے انتظامی امور کے ضامن افراد کے ضمن میں اس المیے کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے۔ ناول میں مملکت پاکستان کی تشکیل کے وقت سے ہی ایک برائی کی موجودگی کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول اور عصری تاریخ آپس میں ایک مضبوط رشتے کے ساتھ باہم منسلک ہوتے ہیں۔ جس طرح انسانی معاشرہ آگے بڑھ کر ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے، رفتہ رفتہ تغیر و تبدل کے مختلف مراحل سے بھی اس کا گزر ہوا، اس کے ساتھ ساتھ معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات و حالات بھی ناول کا موضوع بنتے رہے اور یوں ناول کی صنف بھی پروان چڑھتی رہی۔ خالد فتح محمد اپنے تحقیقی فن پارے کے لیے سماج سے موضوعات اخذ کرتے ہیں۔ لہذا ان کے عہد میں رونما ہونے والے واقعات لامحالہ ان کے ناولوں کا شعوری اور لاشعوری طور پر حصہ بن جاتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں ایسے عصری واقعات جب گردشِ دوراں میں قعرِ گمنامی میں چلے جاتے ہیں تو ان کے ناولوں میں واضح یا بین السطور انداز میں زندہ و جاوید ہو

جاتے ہیں۔اسی طرح جب خالد فتح محمد اپنے عصرِ حاضر کے حالت و واقعات سے متاثر ہوتے ہیں تو گزشتہ تاریخی حقائق و واقعات بھی ان کے صفحہ ذہن کو قلم زن ہونے پر ابھارتے ہیں۔اس طرح ان تمام گزشتہ تاریخی واقعات کی جھلک ان کے زیرِ جائزہ ناول میں جھلکتی نظر آتی ہے ناول میں افسر شاہی کے ضمن میں رشوت ستانی کے پس منظر میں تاریخی واقعات بھی موجود ہیں نیز بعض اوقات ناول میں بین اسطور تاریخی واقعات کے حوالے بھی موجود ہیں۔ناول کا کردار عبدالمجید افسر شاہی کی قباحتوں کا تذکرہ کرتا ہے تو تاریخی واقعات کی مدد سے بھی تمام حالات معظم علی خان پر آشکار کیے جاتے ہیں۔یہاں دورِ حاضر کے واقعات کی عکاسی میں تاریخی عناصر اپنے عروج پر نظر آتے ہیں۔

ناول کی کہانی مرکزی کردار ''معظم علی خان'' کے گرد گھومتی ہے جو کہ ایک کامیاب صنعت کار ہے۔اور اس کی مصنوعات ملک کے اندر اور باہر مساوی طور پر مقبول ہیں۔وہ ایک بڑی تنظیم کا سربراہ ہے۔وہ ناول کے ایک کردار ''پری'' کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ ''پری'' کے کردار کے بارے میں نطاشہ مسعود یوں رقمطراز ہیں: ''پری ایک خیالی کردار ہے جو معظم علی خان کو سحر زدہ کر دیتا ہے اور وہ پوری طرح اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔''(۲۲)

جس کی بدولت اس کی ملاقات ملکی سیاسی کارکنوں سے ہوتی ہے۔جن کی بدولت اسے سیاست سے متعلقہ امور سے شناسائی ہوتی ہے جن کے بارے میں وہ اس سے قبل مکمل طور پر ناآشنا تھا۔یہ اس کے لیے ایک نیا تجربہ اور میدان تھا۔سیاسی میدان کے تمام اسرار و رموز اس پر ایک اہم کردار ''عبدالمجید'' کے توسط سے آشکار کیے جاتے ہیں۔عبدالمجید ایک کامیاب سیاست دان ہے اور سیاست ہی اس کا ذریعہ معاش بھی ہے۔وہ ملکی سیاست میں ایک ''پول'' یا کمیٹی بنانے کا خواہاں تھا جس کے لیے وہ معظم علی خان کا انتخاب کرتا ہے۔اس پورے ناول میں ملکی سیاست میں افسر شاہی کے کردار کی عکاسی بھی مختلف پہلوؤں کے حوالے سے کی گئی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ایک ایسا سنہری دور آیا جس میں ملکی صنعتی ترقی کو فروغ حاصل ہوا۔بدقسمتی سے بحیثیت مجموعی عوامی مفاد کا استحصال کیا گیا اور ملکی صنعت کی جڑیں کھوکھلی کر دی گئیں اور رفتہ رفتہ وہ اپنی شناخت اور وجود کھو رہی تھیں۔ملک قرضوں کے بوجھ تلے دبنا شروع ہو گیا۔جو کسی بھی نوزائیدہ مملکت کے لئے کسی بھی بڑے خطرے کا پیش خیمہ ہو سکتا تھا۔اس ناگفتہ بہ صورت حال کے پیش نظر امریکہ نے ہماری ملکی معیشت کو سہارا دینے کے لیے قرضوں کی فراہمی کا آغاز کر دیا جو کہ مختلف ضروریات کے پیش نظر آتے رہے اور اجتماعی

مفاد کی جگہ انفرادی مفادات نے لے لی اور ملکی حالات ابتر سے ابتر ہوتے چلے گئے۔ یہ امداد کچھ اقربا پروری، کچھ رشوت اور کچھ خرد برد کے ذریعے انفرادی مفادات میں استعمال ہوتی رہی۔ جس میں سویلین اور فوجی بیوروکریسی کا عمل دخل تھا۔ زیر تحقیق ناول ''پری'' میں ان تمام حالات کے بارے میں معظم علی خان کو عبدالمجید کے توسط سے معلوم ہوتے ہیں۔ ناول کا ایک اقتباس بطور مثال ملاحظہ کیجیے جس میں مکالماتی انداز اختیار کیا گیا ہے:

> ''امداد کو تقسیم کرنے کے ذمہ دار افراد دولت سمیٹتے رہے۔ جتنا جہاں جانا چاہیے تھا اس سے بہت کم وہاں پہنچا۔ پڑوسی کے بحران کو قومی ذریعہ بنانے کے بجائے انفرادی فائدے حاصل کیے گئے۔ عالمی طاقت کے انخلا کے بعد جب ہم نے تجزیہ کیا تو ملک کی حالت پہلے سے بھی ابتر تھی۔۔۔۔ سویلین اور فوجی بیوروکریٹوں نے مل کے ملک کو ایک بار پھر ترقی کی پٹڑی سے نیچے اتار دیا۔''(۲۳)

ناول ''پری'' کے ساتھ ہی ایک اور ناول ''کرک ناتھ'' رواں صدی میں منظر عام پر آیا۔ جس کا تذکرہ گزشتہ باب میں کیا گیا ہے۔ ایک جدید ناول نگار حفیظ خان کی جانب سے تحریر کردہ یہ ناول افسر شاہی سے جڑے ہوئے خفیہ ہاتھ کی بھیانک کارفرمائیوں کو آشکار کرتا ہے اور مختلف النوع جبر و استحصال کو منکشف کرتا ہے جو نہتے انسانوں پر آزمائے جاتے ہیں۔ استحصال زدہ اور استحصال کنندہ کی یہ باہمی کشمکش ازل سے انسانی جبلت میں موجود ہے۔ دراصل استحصال زدہ اور استحصال پسند کرداروں کی باہمی چپقلش اپنی تمام تر قباحتوں کے ساتھ مابعد نوآبادیاتی دور کی افسر شاہی میں موجود ہے۔ عصر حاضر کی افسر شاہی کی غلامانہ اور مرعوبانہ ذہنیت کی قباحت رشوت ستانی ہے۔ اس میں افسر شاہی کے بیشمار پہلوؤں پر قلم زنی کی گئی ہے۔ محمد حفیظ خان کا عصری شعور بھی ان کے ناول میں جھلکتا ہے۔ ان کے زیرِ نظر ناول میں افسر شاہی کی تمام تر قباحتیں ہر قدم پر کھڑی نظر آتی ہیں۔ ناول میں رشوت کی بیشتر اشکال کی عکس بندی کی گئی ہے۔ ناول کی ورق گردانی سے معاصر دور میں افسر شاہی کے حوالے سے جو پہلو صفحہ ذہن میں ابھرتا ہے وہ بلاشبہ رشوت ہے۔

دورِ حاضر میں جس تیز رفتاری سے سماجی مسائل میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اس کی وجہ سے تمام شعبہ ہائے زندگی میں رشوت اور سفارش ایک معمول بن گئی ہے۔ بدعنوانی اور رشوت ایسے وبائی امراض جو دیمک کی طرح ہمارے سماج کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جو ایمانداری سے

اپنے فرائض منصبی سر انجام دے رہے ہیں۔ایسے تمام ذمہ دار افراد جو سرکاری دفاتر میں قوم کے خدمت گار کی حیثیت سے متمکن ہیں اور وہ اپنے اس فرض کی ادائیگی کے عوض اجرت وصول کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی رشوت کا مطالبہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔نتیجے کے طور پر سماجی سطح پر کئی دوسری برائیاں جنم لے رہی ہیں۔غرض یہ کہ سفارش،رشوت اور بدعنوانی اب ہمارے سماج میں ثقافتی حیثیت اختیار کرتی چلی جا رہی ہیں۔کوئی بھی افسر اب اسے باعث ندامت و شرمندگی محسوس نہیں کرتا۔طاقت اور اقتدار کے غیر قانونی استعمال کی وجہ سے عوام الناس میں اس مروجہ نظام اور محنت پر سے اعتبار یکسر ختم ہو گیا ہے۔افسر شاہی کا ادارہ اپنے مقاصد کے اعتبار سے مفید اور محترم گردانا جاتا ہے۔مگر اداروں میں موجود بدعنوان افراد کی موجودگی اور ان کی بدعنوانی سے قطعاً انکار ممکن نہیں۔دورِ حاضر میں اس طبقے کے مشاہدے اور تحقیق سے یہ نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں کہ رشوت اور بدعنوانی کا زہر پورے سماج کی رگوں میں رچ بس گیا ہے۔اخلاقی انحطاط کے شکار اس معاشرے میں بنی نوع انسان کو قدم قدم پر رشوت ستانی اور بدعنوانی سے واسطہ پڑتا ہے۔ایسے دگرگوں حالات میں کسی بھی کام کا استحقاق صرف اسی فرد کا ہے جو کسی نہ کسی صورت میں رشوت دے سکے۔ناول میں مرکزی کردار 'بڑے صاحب' کا ہے۔عصری حالات و واقعات کی بنت میں اس کا کردار انتہائی اہم ہے۔کردار افسانوی ہی سہی لیکن عصری حقائق کو مسخ نہیں کرتا۔یہ کردار دراصل افسر شاہی کی تمام تر قباحتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ناول کے کرداروں کی اگر بات کی جائے تو زیادہ تر کردار افسر شاہی نظام کے استحصالی رویے کی بدولت پریشان اور مضطرب دکھائی دیتے ہیں جن کے لیے راہِ فرار حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ماہین،ذفیرہ احمد اور دیگر ضمنی کردار عصر حاضر کے ایسے کردار ہیں جو سازشوں،رشوت اور دیگر بدعنوانیوں کی وجہ سے اس غلام گردش میں جکڑے ہوئے ہیں۔بدعنوان افراد دوسرے سماج دشمن عناصر کے ہاتھوں کٹھ پتلیاں بن کر اپنے ہی جیسے انسانوں کا خون بہا رہے ہیں اور اور بھرا انہی بے بس لوگوں کے لہو پر اپنے نام نہاد اقتدار کو سجائے پھرتے ہیں۔ناول میں ایسے کردار بھی موجود ہیں جو مارِ آستین کی صورت اپنے ہی جیسے شہریوں کو ڈستے ہیں۔مذکورہ ناول میں بڑے صاحب کی شکل میں ایسے ہی استحصال کنندہ افراد کا ذکر موجود ہے۔جو سازش اور رشوت ستانی جیسے گھناؤنے فعل کا مرتکب ہوتے ہیں۔زیر نظر ناول میں مرکزی کردار ''بڑے صاحب'' زفیرہ احمد کو ان تمام احوال و آثار کی بابت بالکل واضح الفاظ میں تنبیہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔بڑے صاحب کے درج ذیل الفاظ اس کی طاقت اور اقتدار کی عکاسی کرتے ہیں:

''یہاں دن کو حکومت جس کی بھی ہو ،رات کو ہم جیسوں کی ہوتی ہے۔دن کو سیکریٹریٹ سجتا ہے اور رات کو فارم ہاؤسز۔۔۔۔۔دن کو فائلیں ایک میز سے دوسری میز گھومتی ہیں اور رات بھر مست اندام لڑکیاں ایک گود سے دوسری گود بدلتی رہتی ہیں۔۔۔۔دن کو لگنے والی دیہاڑیاں بھی رات کو طے پاجاتی ہیں اور صبح کون سے اخبار میں کس قسم کی اور کتنے حاشیے کی خبر شائع ہو گی، یہ سب کچھ یہاں رات کو ہی ہماری منشا کے صحافیوں کو عطا ہونے والے لفافوں کے حجم اور شراب کی بوتل کے برانڈ پر منحصر ہوتا ہے۔۔۔۔''(۲۴)

اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو بڑے صاحب نے اپنے مخالفین کے لیے ایک اور حربے کا استعمال بھی کیا جسے عام اصطلاح میں ''Nuisance value'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔یہاں یہ اصطلاح وضاحت طلب ہے۔Collins English Dictionary میں اس کی وضاحت کچھ یوں کی گئی ہے:

''The usefulness of a person's or thing's capacity to cause difficulties or irritation.''(25)

اردو زبان میں اس اصطلاح کی توضیح یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ بلیک میلنگ کی متشکل ہے جو مخالفین حکمران کی کسی بھی کمزوری کو بھانپ کر اس کو اپنے مفاد کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے حکمران کو کئی ناجائز اعمال کا مرتکب ہونا پڑتا ہے کہ کہیں وہ بھرے بازار میں اس کو آشکار نہ کر دیں۔زیر تحقیق ناول میں اسی اصطلاح کو مد نظر رکھ کر بڑے صاحب کی رشوت ستانی کی بدولت کی گئی بلیک میلنگ کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے:

''ایسے میں بڑے صاحب نے یہ دیکھا کہ اس دھندے میں چوروں کو مور پڑنے کا امکان اتنا ہی ہوتا ہے کہ جتنا چوری کا تو اس نے خود پس منظر کے بھی پس منظر میں رہتے ہوئے ایک دھانسو قسم کے اخبار کا ڈیکلیریشن اور ایک سٹیلائٹ ٹی۔وی چینل کا لائسنس لے کر سبھی معاملات کو چند ہفتوں میں اس طرح عملی شکل دی کہ تمام معروف کالم نگار اور صحافی منہ مانگی قیمت پر اس کے اخبار کے ادارتی صفحے پر اور شام سات بجے سے رات گیارہ بجے تک چائے کی پیالی میں طوفان بھرپا کرنے

والے سبھی ٹی۔وی اینکرز اس کے چینل کی اسکرین پر گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنے چلانے کو بیٹھ گئے۔ بڑے صاحب کو کسی بھی شخص کی بولی لگانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔اس کی پہلی آفر ہی اتنی پر کشش ہوتی کہ سننے والے کو اپنی رال روکنی مشکل ہو جاتی۔''(۲۶)

محمد حفیظ خان کو اس نظام کی رشوت ستانی، دغا بازی اور انسانی قدروں کی پامالی پر بہت اعتراض ہے۔ ہمارا سماج ترقی کی بجائے تنزلی کی طرف جارہا ہے۔ محمد حفیظ خان کا معاشرے اور افسر شاہی نظام کے متعلق اپنا ایک نقطہ نظر ہے جس کو انہوں نے ناول جیسی ادبی صنف میں سمو دیا ہے۔ ہر ناول نگار انسانی زیست، سماج اور دیگر مظاہر کے بارے میں اپنی کوئی نہ کوئی ذاتی سوچ رکھتا ہے جو کہ ناول نگار کا نقطہ نظر کہلاتی ہے اور یہی نقطہ نظر اس کے تمام مشاہدات و تجربات پر مکمل طور پر اپنی گرفت مضبوط کیے ہوئے ہوتا ہے۔ محمد حفیظ خان نے اپنے ناول میں اس نقطہ نظر کو نہایت احسن طریقے سے برتا ہے۔نقطہ نظر کے حوالے سے اسلم آزاد نے اپنی کتاب ''اردو ناول آزادی کے بعد'' میں لکھا ہے:

''ناول میں نقطہ نظر کا اظہار بھی ایک خاص فنی سلیقے سے ہوتا ہے،نقطہ نظر کے اظہار میں بے جا جوش و خروش سے کام لینا غیر مستحسن ہے اور اس لیے کہ اس کی وجہ سے کبھی خطابت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی ناصحانہ انداز ابھر آتا ہے۔ خطیبانہ اور ناصحانہ میلان ناول کے فنی حس واثر کے لیے بہت نقصان رساں ہے۔ناول کو دفترِ وعظ و نصیحت بنا دینا تو آسان ہے مگر اس کو فنی طور پر ناول بنائے رکھنا مشکل ہے۔ قاری کو ہر گز یہ محسوس نہیں ہونا چاہیے کہ نقطہ نظر اوپر سے لادا گیا ہے یا یہ کہ ناول نگار کو فنی تقاضوں سے زیادہ اپنا نقطہ نظر عزیز ہے۔''(۲۷)

محمد حفیظ خان نے معاشرے کی اس حقیقت کے متعلق اپنے نقطہ نظر کو کرداروں کی صورت میں پیش کیا ہے جس پر بعض اوقات تو صداقت کا امکان ہوتا ہے کیونکہ تمام کردار اور ان کا طرزِ عمل اور رویہ ہمارے ارد گرد کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ بڑے صاحب جیسے استحصال پسند کردار کو براہِ راست مدد و حمایت حاصل رہی تھی کیونکہ ایک طرف تو لوگوں کو اپنے مقاصد کے حصول کے ضمن میں بھاری معاوضہ ادا کر رہا تھا تو دوسری جانب استحصال، استحصال زدہ طبقات اور مقتدر طبقات میں تفریق کر کے اپنے مقاصد کے لیے ذہنی اور

نفسیاتی طور پر استعمال کرتا ہے۔ یہ سب یک طرفہ نہ تھا، اس میں کئی شعبے شامل تھے۔ افسر شاہی اور استحصال کا یہ ماحول کئی صدیوں کی تاریخ لیے ہوئے ہے اور دورِ جدید میں بھی اپنی جڑیں مضبوط کر رکھی ہیں۔ افسر شاہی کے سرکردہ لوگ یا تو رشوت اور دیگر بدعنوانیوں کا مرتکب ہوتے ہیں یا انہیں حکامِ بالا کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔ سرکاری حکامِ اعلیٰ کی حمایت سے مقامی حکام دوسرے افراد کو تحقیر آمیز نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ایسے تمام تر عیوب ہمیں بڑے صاحب کے کردار میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ یہ کردار تمام کرداروں پر اپنی طاقت کی وجہ سے حاوی دکھائی دیتا ہے۔ یہ حاکم اور محکوم کے ٹکراؤ کی صورتحال ہے۔ ذفیرہ احمد کے ہاتھوں بڑے صاحب کو شکست کا احتمال ہوا تو اس نے ایک جامع حکمت عملی وضع کی تاکہ منظر پر آئے بغیر تمام حالات اس کے حق میں فیصلہ دیں۔ اس کو بڑا خطرہ لاحق تھا کہ میڈیا چینلز پر اس کی سازشوں کا راز افشا ہو جائے گا تو اس نے ایک سٹیلائٹ ٹی۔ وی چینل کا لائسنس اور اخبار کا ڈیکلیریشن حاصل کر کے تمام حالات کا رخ اپنی جانب موڑ لیا لیکن یہ سب کچھ اس نے رشوت کے بل بوتے پر انجام دیا جس کی وضاحت درج بالا ناول کے اقتباس میں کی گئی ہے۔ یوں بڑے صاحب کا سماج اور اخلاقی اقدار کے خلاف جانا انہی قباحتوں کا اظہار یہ ہے۔ ذفیرہ احمد اور بڑے صاحب میں ایک دوسرے کے خلاف انتقامی کاروائی کا عنصر بھی موجود ہے۔ یہاں پر ناول نگار نے استحصالی قوتوں کو کسی بھی فرد کا استحصال کرتے ہوئے باہم مربوط و متفق دکھایا ہے۔ جس سے اس کا مقصد و نقطہ نظر یہ ہے یہ قومیں کسی بھی فرد کا استحصال کرتے ہوئے باہم اتفاق و اتحاد کا مظاہرہ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ دیکھا جائے تو میڈیا چینلز اور اخبارات بھی افسر شاہی سے مختلف نہیں جو اثر و رسوخ اور دولت کے زور پر انصاف کا خون کرتے ہیں۔ ذفیرہ احمد اس نظام میں اس طرح جکڑی جاتی ہے وہ اس کے خلاف ابتدا ہی سے کسی بھی قسم کا احتجاج نہیں کر پاتی۔ وہ جو بھی کرتی ہے اس کا دائرہ کار کافی محدود ہے۔ وہ اس ناانصافی، زیادتی اور ظلم کو 'یہاں' سے 'وہاں' پیش کر کے انصاف کی طلب گار ہوتی ہے لیکن اسے ہر قدم پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ محمد حفیظ خان نے ناول میں اس نظام سے متعلقہ افراد کی نفسیات کو سامنے رکھ کر کرداروں کی تخلیق کی ہے۔ جو ان کے سیاسی، سماجی اور عمرانی پہلوئے حیات سے واقفیت و آگہی کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس ناانصافی کے خلاف ذفیرہ کا ساتھ کوئی نہیں دیتا۔ محمد حفیظ خان نے اس نظام کے ہاتھوں پسنے والے مجبوروں کے متعلق بتایا ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ یہ نظام متاثرہ فریق کی سماجی محرومیوں اور استحصال میں کتنا کردار ادا کرتا ہے اور کامیاب ہونے والے کردار کی مستقبل کی نفسیات کس نہج اور جہت پر تشکیل کی جاتی ہے۔ ذفیرہ احمد نے جس قسم کے احتجاج کو اپنایا ہے وہ شدت پسندانہ جذبات کا حامل ہے۔ جس معاشرے میں دھوکہ، رشوت، سفارش، اور فریب کرنے

والے لوگوں کی حوصلہ افزائی اور پشت پناہی کی جاتی ہو وہاں ایسے جذبات ورجحانات دکھائی دیتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے معاشرے میں افراد کی ذہنی، تعمیری و تخلیقی صلاحتیں جمود کا شکار ہو جاتی ہیں۔ نتیجے کے طور پر افراد اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو محنت اور کوشش کے بجائے منفی نوعیت کی سرگرمیوں میں صرف کرتے ہیں۔ زفیرہ احمد اس معاشی و سماجی استحصال کے خلاف احتجاج میں اکیلی ہے۔ ناول میں افسر شاہی کی قباحتوں کا ہر پہلو عکس ہوا دکھائی دیتا ہے۔ افراد کے اختلافات کے سلسلے میں سرکاری قوانین کو بھی بالائے طاق رکھنے کو موضوع بنایا گیا ہے اور اس محکمے کے اہلکاروں کی قانون کی بالادستی اور پاسداری کے ضمن میں انحراف کی جو تصویر کشی کی ہے وہ ہمارے ارد گرد کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ آج بھی بڑے صاحب جیسے لوگ کہیں نہ کہیں قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتے نظر آتے ہیں۔ مزید یہ بھی سامنے آتا ہے کہ افسر شاہی اور رشوت ستانی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

ناول میں رشوت ستانی کا پہلو صاف ظاہر ہے کہ کس طرح مقتدر طبقات پس پشت رہ کر اپنے مذموم مقاصد کے حصول کو ممکن بنتے ہیں۔ یہ سب کچھ دولت کے لین دین سے ہی ممکن بنایا جاتا ہے۔ بڑے صاحب رشوت دے کر اخباری نمائندوں کو خرید لیتا ہے جو عوام سے حقیقت کو چھپا کر رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا استحصالی رویہ ہے جو افسر شاہی کے ضمن میں اختیار کیا جاتا ہے۔

درج بالا المیے کی عکاسی ناول کے درج ذیل اقتباس میں بھی کی گئی ہے کہ جب بڑے صاحب دانش سعید کو زفیرہ احمد کی طرف سے بھیجی گئی فوٹیج کے آن ایئر نہ ہونے کی وجوہات بتاتا ہے اور زفیرہ احمد سے اپنے مفاد کے حصول کے لیے رشوت کا ذریعہ استعمال کرتا ہے۔ یہاں دانش سعید اور بڑے صاحب کے مابین ہونے والا مکالماتی انداز بیان ملاحظہ کیجیے:

> ''میں بھڑوا صاحب صرف عورتوں کی بھڑوا گیری کر کے نہیں بنا۔۔۔۔۔ یہ تمام شعبے تمھارے ہمارے معاشرے اور حکومت کے میرے سامنے یوں الف ننگے ہیں۔۔۔ جانتے تو آپ بھی ہو اور جانتی تو یہ گشتوڑی بھی ہے کہ ہم بھڑووں سے کیا چیز چھپی ہوتی ہے؟ نیت سے بدنیتی تک ہر چیز کپڑے اتار کے لیٹی رہتی ہے قدموں میں، بس ریٹ لگانے کا ہنر آنا چاہیے۔۔۔۔ آپ بھی اس کا ریٹ لو۔''(۲۸)

خالد فتح محمد کے ناول 'پری' پر اقربا پروری کے حوالے سے بات کرنے کے قبل سماج میں اس کے اثرات پر نظر دوڑانی چاہیے کیونکہ کوئی بھی ادب اپنے فن پاروں میں وہی کچھ پیش کرتا ہے جو اس کے ارد گرد وقوع پذیر ہو رہا ہوتا ہے۔اس حوالے سے مبین مرزا کچھ یوں گویا ہوتے ہیں:

> ''اس کے (ادب کے) جذبہ و شعور کی تشکیل و تعمیر میں ایک حصہ اس کے عہد کا،اس کی تہذیب اور سماج کا بھی ہوتا ہے۔اس حقیقت کو فنکار اور اس کا معاشرہ دونوں مانتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں۔اس طرح فنکار کے نمایاں ہونے میں ایک طرف عصری شعور نمایاں ہوتا ہے تو دوسری طرف وہ ازلی و ابدی حقیقتیں بھی اس کے یہاں راہ پاتی ہیں جو نوع انسانی کی تجربی صداقتوں کو عہد بہ عہد آگے بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔''(۲۹)

عہد حاضر سیاسی و سماجی لحاظ سے بدامنی اور انتشار کا زمانہ ہے۔یہ دور جہاں اور متعدد مسائل و مشکلات سے دوچار ہے وہیں سب سے سنجیدہ مسئلہ اقربا پروری ہے جو کہ ایک عام آدمی اور ادیب کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرتا ہے۔آج اگر ہم اپنے گرد و نواح میں نظر دوڑائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جو فرد بھی کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہوتا ہے تو وہ اپنے دوست احباب اور عزیز و اقارب کو نوازنے کا ایک لا متناہی سلسلے کا آغاز کرتا ہے۔دورِ حاضر میں جو نوجوان نسل محنت کے بل بوتے پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی ہے جب وہ اپنی عملی زندگی کا آغاز کرتے ہیں تو انہیں خویش پروری جیسے مسئلے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔جس دور میں بھی جس بھی نظام میں اقربا پروری جیسا عنصر موجود ہو تو نظام میں خرابیاں جنم لیتی ہیں۔چاہے ان اداروں کی نوعیت دینوی ہو یا دنیاوی۔اقربا پروری نے نتیجے میں سماج میں نااہلی اور نالائقی اپنے قدم جما لیتی ہے جس کے نتیجے میں متعلقہ سماج تباہی و بربادی کی راہوں پر چل پڑتا ہے۔اقربا پروری کے ساتھ سیاسی وابستگی سے بھی اس کو تقویت ملتی ہے۔حکومتی حوالے سے بھی برسرِ اقتدار لوگ ہر چھوٹے بڑے عہدے پر اپنے ہی ہم نوا لوگوں کو فائز کرتے ہیں۔سرکاری اداروں میں اقربا نوازی کی بدولت 'اپنوں' کا تقرر اداروں کو تنزلی کا شکار کر دیتا ہے۔اگر مختلف شعبوں میں مناسب،فعال،اہل اور قابل افراد کی کارکردگی کا تقابل سفارش اور اقربا پروری کی بدولت پروان چڑھے ہوئے افراد کے ساتھ کیا جائے تو حقیقت واضح دکھائی دیتی ہے۔یہ برائی نتیجے کے طور پر سماج سے، قانون سے،اصول و ضوابط سے اہل افراد کو بغاوت پر اکساتی ہے جو کسی بھی معاشرے کے لیے ''ستم قاتل'' ہے۔آج اگر ہم عہد حاضر کے حالات پر

ناقدانہ نظر دوڑائیں تو سماج میں چہار سو پھیلی ہوئی بے یقینی، ناامیدی اور بے حسی کا سب سے بڑا منبع اقربا پروری ہے۔ کوئی بھی معاشرہ اس وقت تک اخلاق، ضوابط، قوانین اور معاشرتی اقدار کی طرف مائل نہیں ہو سکتا جب تک معاشرے سے خویش پروری، سفارش اور سیاسی وفاداری کا قلع قمع نہیں کیا جاتا۔

ناول نگار چونکہ معاشرے کا ایک حساس رکن ہوتا ہے اس کا دل ہر طرف پھیلی بے اعتدالی، نا انصافی، استحصال اور مظالم کے خلاف کڑھتا ہے۔ ان تمام دلبرداشتہ کیفیات کا اظہار وہ ناول میں فرضی کرداروں کی صورت میں کرتا ہے۔ ناول 'پری' کو بھی سماجی حقیقت نگاری کی تاریخ میں اولیت حاصل ہے۔ اس ناول میں معاشرے میں اقربا پروری، معاشرتی ناہمواری اور ان سے جنم لینے والی ناآسودگیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ طبقاتی تقسیم، معاشرتی اونچ نیچ، سماجی بدعنوانیاں ہماری اکیسویں صدی کے ایسے مسائل ہیں کہ جن سے ناول کی معنویت اور موضوعات تشکیل پاتے ہیں۔ دورِ حاضر کی انتظامی حکومت پر تنقید کی گئی ہے۔ نظام کی خرابی، عوام کو حقیقت سے بے خبر رکھنا اور انسانی تذلیل ایسے جرائم ہیں جن کی عکاسی ناول میں جابجا کی گئی ہے۔ مقامی لوگوں کا معاشی، سماجی، انتظامی اور سیاسی سطح پر استحصال کا بھی محولا بالا ناول میں تذکرہ موجود ہے۔

زیر تحقیق ناول ''پری'' میں مقتدر طبقات کے استحصالی رویوں کے ایک پہلو اقربا پروری کا عکس جھلکتا نظر آتا ہے جو کہ عمومی طور پر ہمارے سماج میں انتشار اور بدنظمی کا موجب بنتا ہے۔ افسر شاہی میں افراد کی بدعنوانی اس انتشار کی ایک کڑی ہے جو کہ ایک طرف تو اس فرد کی کامیابی کا باعث بنتی ہے تو دوسری طرف سماجی استحصال کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ ناول کی فصل اول میں مرکزی کردار معظم علی خان کی زبانی اس کے آباؤ اجداد کی بدعنوانی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ برصغیر پاک و ہند کا دور تھا۔ اس وقت کرپشن کا کوئی خاص چلن نہیں تھا لیکن اقربا پروری اور دیگر ریشہ دوانیاں زوروں پر تھیں۔ معظم علی خان کے پردادا نے محکمہ پولیس میں ملازمت اختیار کر لی اور اس نے اپنے خاندان کی کفالت اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے بڑے تھانیداروں کی خرید و فروخت کی رقم میں سے کچھ حصہ اپنے پاس محفوظ کر لیتا تھا۔ یہیں سے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے اخراجات کو پورا کیا۔ ملک کے بٹوارے کے وقت بہت سے خاندانوں نے مراعات کے عوض سونا حاصل کیا جو کہ ناول میں افراد کی بدعنوانی کی عکاسی کی تصویر کشی ہے۔ معظم علی خان کی زبانی یہ تصویر ملاحظہ کیجیے:

> ''خود وہ بڑے تھانیداروں کا اردلی رہا۔ ان کے لیے ضروریات کی خرید و فروخت
> میں سے ہمیشہ چند پیسے اپنی جیب میں ڈال لیتا۔ اپنا اور بیٹے کا کھانا بھی انہیں کے

باورچی خانے سے آتا۔ میرے باپ نے جب دسویں پاس کی تو اس وقت نہ صرف وہ شادی شدہ تھا بلکہ میری پیدائش بھی ہو چکی تھی۔ یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ ملک تقسیم ہوا تو میرا دادا اسی شہر میں ملازمت کر رہا تھا۔ اس نے لوٹ مار میں عملی حصہ تو نہیں لیا لیکن ہندستان جانے والے خاندانوں سے مراعات کے بدلے سونا ضرور لیا۔"(۳۰)

آج کل کے دور کا سب سے اہم مسئلہ سیاسی، انتظامی اور حکومتی امور میں اقربا پروری ہے۔ ملک میں ہر طرف افراتفری، بے انتظامی اور ناانصافی کا راج ہے۔ قومی اداروں میں اقربا پروری جیسی بدعنوانی پھیلی نظر آتی ہے جس کی وجہ سے ملک و قوم کو ناقابل تلافی نقصانات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ اکثر و بیشتر سرکاری ادارے اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں ناکام نظر آتے ہیں اور وہاں اقربا پروری اور بدعنوانی موجود ہے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ عنصر پھیلتا ہی چلا جا رہا ہے اور اس کے تدارک کی تمام سعی ناکام نظر آتی ہے اور ملک بھر میں بدعنوانی، ناانصافی اور اقربا پروری کی صورتحال دن بدن سنگین سے سنگین تر ہوتی جا رہی ہے۔ حکومتی اور سرکاری اداروں میں اقربا نوازی، حصولِ انصاف کا کمزور نظام، خامیوں سے بھرپور قانون کا نفاذ اور بدعنوان افسران کی وجہ سے عوام الناس میں بے بسی اور بے اختیاری کا احساس بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ عوام میں عدم اطمینان کی بدولت حکومتی اور سرکاری اداروں پر ان کے اعتماد میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ مہذب معاشروں میں بدعنوانی چاہے اس کی قسم کوئی بھی ہو اسے مجرمانہ قتل ہی سمجھا جاتا ہے۔ اقربا نوازی جیسی بدعنوانی اس وقت سر اٹھاتی ہے جب ایک عوامی عہدہ یا دفتر رکھنے والا یا دیگر سرکاری ملازمین اپنے ذاتی مفاد کے لیے اس عہدے کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ جھوٹ اور اقربا پروری مثبت نتائج حاصل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ سرکاری اداروں کو سیاسی مداخلت اور خویش پروری کی بنیاد پر تباہ کر دیا گیا ہے۔ اہل، قابل اور ذہین افراد کی بجائے اپنی پسند کے افراد کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان اداروں کی کارکردگی خراب ہوئی ہے۔ یہ ایک یقینی امر ہے کہ اگر اعلیٰ افسران جھوٹ اور اقربا پروری کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے تو پورا معاشرے میں جھوٹ اور اقربا پروری کا بول بالا ہو گا۔ ناول 'پری' میں اس معاشرت کی سچی تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ ناول نگار نے عبدالمجید کے کردار کی سیاسی بصیرت کے طور پر اس تمام معاشرے کو بیان کیا ہے۔ عبدالمجید اپنے علم کی بنیاد پر معظم علی خان کو جو کہ اس نظام سے قطعی ناآشنا ہے، کو اس کی جھلک دکھاتا ہے۔ ناول میں ناول نگار مکالماتی

انداز تحریر اپناتے ہوئے افسر شاہی کی اقربا پروری کی مزید گرہیں کھولتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ عبدالمجید (جس کو ملکی سیاست سے شغف ہے) بیوروکریسی اور فوج کے گٹھ جوڑ کو مکمل طور پر معظم علی خان اور پری پر آشکار کرتا ہے جو اس کی سیاست سے دلچسپی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہاں عبدالمجید کی زبانی یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ فوج نے اپنے تمام عزائم کی تکمیل کے لئے بیوروکریٹوں کو استعمال کیا جنھوں نے بظاہر وفاداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے مفاد کو ترجیح دی اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کا عمل بروئے کار لایا گیا۔ نتیجتاً بائیس خاندانوں کا وجود عمل میں لایا گیا اور دولت کی تقسیم انہی کے گرد گھومتی رہی جس سے صرف چند مخصوص لوگ مستفید ہو سکے۔ مثال کے لئے ناول کا اقتباس درج کیا گیا ہے:

> ''اس تناظر میں پہلا کمانڈر ان چیف اپنے تمام ترکرومز کے ساتھ سٹیج پر آیا۔ اس نے بیوروکریٹوں کی ایک ٹیم ترتیب دی۔ اس ٹیم میں بڑے نام شامل تھے۔ ان لوگوں نے اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے ہر اس نظریے کی تائید کی جو فوجی نقطہ نظر کا حامی تھا۔ انھوں نے دولت کو پھیلانے کے بجائے سکیڑنے کو ترجیح دی جس کے نتیجے میں بائیس خاندان معرض وجود میں آئے۔ اس کا نظریہ تھا کہ دولت غریبوں تک پہنچنے کی بجائے چند ایک ہاتھوں میں ہو جہاں سے وہ چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے باہر نکلتی رہے۔ پانی کے قطروں کی طرح اور پھر ایک لہر بن کے ہر سو پھیل جائے۔ دولت سمیٹنے کے بعد سمٹی ہی رہی۔ جیسا میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں صرف چند لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔''(۳۱)

پورے ناول میں افسر شاہی اور سیاست کے ضمن میں بہت سے راز افشاء کیے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر کسی معاشرے کو درپیش مسائل سے واقفیت حاصل کرنی ہو تو اس معاشرے میں لکھے گئے ناول اس ضمن میں بہترین رہنمائی دے سکتے ہیں۔ یہ بات ناول 'پری' پر صادق آتی ہے۔ ممتاز حسین ناول اور معاشرے کے تعلق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ناول یورپ کی نشاۃ الثانیہ اور سرمایہ دارانہ عہد کی تخلیق ہے۔۔۔ زندگی میں جو سرعت اور سماجی رشتوں میں جو روز افزوں تبدیلی پیدا ہو رہی تھی، اس نے زیادہ تر لوگوں کو سماجی زندگی کے مظہر کو اس کی جامعیت کے ساتھ پیش کرنے پر مجبور

کیا لیکن اس بنیادی سبب کے باوجود یہ فن زیادہ ترقی نہ کر سکتا اگر سماجی علوم نے معاشرے کی ہیت اور اس کے تاریخی ارتقاء کو سمجھنے میں اور سوسائٹی کے مفہوم کو متعین کرنے میں مدد نہ پہنچائی ہوتی، ان دونوں ہی چیزوں نے مل کر موجودہ دور کی ناول نگاری کو جنم دینے میں حصہ لیا ہے۔"(۳۲)

مذکورہ ناول میں ناول نگار کی حساس طبع نے سیاسی معاملات میں اپنے آپ کو الجھانے کی بجائے انسانی المیے کو موضوع بنایا ہے۔ ناول کے کردار کافی جاندار ہیں اور خاص طور پر معاشرتی زندگی کی جھلکیاں اس ناول میں پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہیں۔ اس ناول کے کردار ہمارے گردوپیش میں موجود عام سے لوگ ہیں۔ ناول کے بیانیے میں پیچیدگی کم پائی جاتی ہے۔ خط مستقیم پر سفر کرتے ہوئے ناول ہذا کے کردار زمان و مکان میں ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک سفر کرتے ہیں۔ اس دوران افسر شاہی نظام کی بدولت پیدا ہونے والے حالات و واقعات میں شکست و ریخت بھی ہوتی ہے۔ کرداروں کے گردونواح میں پھیلی دنیا تغیر و تبدل سے دوچار ہے۔ اس کے باوجود کہیں بھی قاری پر یہ گمان نہیں گزرتا کہ وہ اپنے کرداروں کے ساتھ غیر ضروری طور پر کھیل رہے ہیں یا مصنوعی طرز پر کسی صورت حال کی تخلیق کر رہے ہیں۔ ناول میں ان کا اسلوب دھیمے انداز کا ہے اور وہ ساری توجہ کہانی اور سماج میں موجود افسر شاہی نظام کی عکاسی میں صرف کرتے ہیں۔ ہمارے خطے میں گزشتہ کئی برسوں سے بڑی طاقتوں کی جو کشمکش بہت نمایاں ہو کر ہماری زندگیوں کو تخریبی عوامل سے دوچار کر رہی ہیں۔ اس ناول کے کردار ایک دوسرے سے تال میل میں موجود دکھائی دیتے ہیں۔ اس باہمی تال میل میں امکانات بھی پیدا ہو رہے ہیں اور مسائل بھی۔ ناول میں ہمیں امکانات اور مسائل ہر دو سے واسطہ پڑتا ہے اور انھوں نے ایک ناول نگار کے انداز میں ان تمام حالات سے نبرد آزما ہونے کی سعی کی ہے۔

محمد حفیظ خان نے افسر شاہی سے منسلک افراد و عناصر کے سازش میں ملوث ہونے کو ناول 'کرک ناتھ' میں بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ جس میں خصوصاً اختیارات و اقتدار کو بنیاد بنا کر سماجی استحصال کیا گیا ہے۔ ناول 'کرک ناتھ' انسانیت کی ہونے والی تذلیل، برتے جانے والے استحصالی رویے، جنم لینے والی المیاتی صورتِ حال اور سماجی منافقت کی عمدہ مثال ہے۔ یہاں طبقہ اشرافیہ کی ذریعے سماج کے دیگر طبقات کا استحصال پیش کیا گیا ہے۔ مرکزی کردار 'بڑے صاحب' ایک اونچے طبقے کا فرد ہے جو اپنے ارد گرد موجود سماجی عناصر کا مختلف طریقوں سے استحصال کرتا ہے۔ ذفیرہ احمد اس کے معاشی اور جسمانی استحصال کا شکار ہو جاتی

ہے۔اس کے سامنے استحصال کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنے کی بڑی وجہ بڑے صاحب کے اختیار،اقتدار اور سازشوں کی موجودگی ہے۔اگرچہ شکوک و شبہات کی حد تک اسے بھی یہ استحصال سمجھ میں آتا ہے جو ایک طرف اس استحصال کا شعور ہے تو دوسری جانب اس کے خلاف رد عمل بھی۔ بڑے صاحب احمد کو اسی ردِ عمل سے منع کرتا ہے کیونکہ ایسے ردِ عمل کی وجہ سے اس کی سازشوں کا بھید کھل جانے کا خدشہ ہے۔ذفیرہ احمد کے لیے بڑے صاحب کا تحقیر آمیز لہجہ نہ صرف تکلیف کا باعث ہے بلکہ اس کے لیے نا قابل برداشت بھی،دیکھا جائے تو ہر جملے اور ہر لفظ سے بڑے صاحب کے طبقے کی حقیقت اور ذفیرہ احمد کی اہمیت و حیثیت اور اس کے استحصال کی عکاسی ہوتی ہے۔ایک طرف اگر اس کا سماجی و معاشی استحصال کیا جارہا ہے تو دوسری جانب اس کا جسمانی استحصال بھی ہو رہا ہے۔ناول میں محمد حفیظ خان نے غیر شعوری طور پر اس کے منہ سے جو کلمات ادا کروائے ہیں ان سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ذفیرہ احمد ذہنی طور پر اور معاشی طور پر کس طور استحصال کے لیے تیار ہے۔ذفیرہ احمد بڑے صاحب کی سازشوں کے گورکھ دھندے میں بری طرح الجھی ہوئی ہے۔یہ اس معاشرتی طبقاتی نظام کی علامت ہے کہ جس میں اپنے وجود کو جگہ میسر کرنے اور اپنی حیثیت منوانے کے لیے اسے جسم کا بلیدان دیناپڑے گا۔

ناول میں افسر شاہی کے حوالے سے جہاں دیگر پہلوؤں کی عکاسی موجود ہے وہاں سازش کا پہلو بھی سماجی اور فکری حوالے سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ محمد حفیظ خان نے مقتدر طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک فرد کی سازشوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ پورا ناول اس ایک کردار کی گرفت میں رہتا ہے۔ناول ''کرک ناتھ'' میں ایک درندہ صفت کردار ''بڑے صاحب'' کی صورت میں موجود ہے جو کہ ناول کے تمام مرکزی اور ضمنی کرداروں کے گرد سازشوں کا جال بنتا ہے۔ کردار اس سازش کی دلدل میں اس طرح پھنس جاتے ہیں کہ چاہتے ہوئے بھی اس سے نکل نہیں سکتے اور ان کا فرار حاصل کرنا ناممکن ہے۔ بڑے صاحب اقتدار اور مفادات کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک جانے سے گریزاں نہیں ہے۔اس کہانی کے تار و پود میں ایسے کردار بھی موجود ہیں جن کے نام بالترتیب زفیرہ احمد،دانش سعید اور ماہین ہیں جو کہ بڑے صاحب کی سازشوں کے بھنور میں پھنس جاتے ہیں ۔درحقیقت زیر تحقیق ناول طاقتوں کے باہمی تصادم کی تصویر ہے۔زفیرہ احمد ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی ''مہ نور'' کی مالک و مختار ہے۔جب وہ کمپنی کے کاپی رائٹر ''مبشر رضا'' کے اچانک منظر سے ہٹ جانے کی بدولت کمپنی کو دیوالیہ ہونے سے بچانے کی خاطر بڑے صاحب سے معاونت کی خواہاں ہوتی ہے تو

اس وقت وہ بڑے صاحب کے نام نہاد تعاون و امداد کے نتیجے میں اس کی سازشوں کی جکڑ بندیوں میں الجھ جاتی ہے۔ نیز اس زیر نظر ناول میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ افسر شاہی کی بدولت درپردہ کن کن لوگوں کا کن کن حوالوں سے استحصال کیا گیا ہے۔ اس استحصال میں کون کون سے لوگ اور گروہ شامل رہے۔ سازش کے تناظر میں مختلف استحصالی صورتوں کی تصویر کشی مکالماتی انداز میں کچھ یوں کی گئی ہے:

''فون میں نے نہیں تم نے کیا تھا۔۔۔ کل رات کو۔۔۔۔ بھول گئی کیا سرور ہی سرور میں؟ خیر میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ تمھاری بدحواسیاں سنتا رہوں۔ غور سے سنو! وہ تینوں لوگ تمہیں مل جائیں گے لیکن تمھیں منسٹر صاحب کا رانجھا راضی کرنا ہوگا۔

''کون سے منسٹر صاحب؟''

''بچی نہ بنو اب۔۔۔۔ کتنے منسٹرز ہیں اس حکومت میں کہ جو سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کر سکنے کی طاقت رکھتے ہیں

راؤ صاحب؟

اور کیا۔۔۔ بس اپنی سپر ماڈل کو بھیج دو تین چار راتوں کے لیے اور پھر تمھاری رکی ہوئی گاڑی پھر سے چل پڑے گی۔''

آپ ثنیعہ کی بات کر رہے ہیں؟''

''جی۔۔۔۔''(۳۳)

محمد حفیظ خان کا اکیسویں صدی کا دور سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے بحرانی دور کہلایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جہاں سماجی مسائل کا تعلق ہے تو یہ بات عیاں ہے تو کئی مقتدر طبقات اس کا موجب ہیں۔ یہ ناول محمد حفیظ خان کی افسر شاہی نظام کی نفسیات سے آگہی کی اعلیٰ مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔ ذفیرہ احمد کو بڑے صاحب کے ہاتھوں اپنی حیثیت و اہمیت کا مسئلہ درپیش ہے۔ ناول میں بڑے صاحب کے کئی جملے اس کی استحصال پسندی کی عکاسی کرتے ہیں، یہاں مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ مادیت پرستانہ رویوں نے معاشرتی بنیادوں کو زیر و زبر کر دیا ہے اور افسر شاہی جیسا مہذب ادارہ میں بھی مادہ پرستانہ امیدوں اور ترجیحات سے خالی نہیں ہے۔ ناول میں اس

طبقے کے استحصالی رویے کی ایک واضح نفسیات دیکھنے کو ملتی ہے۔ذفیرہ احمد جہاں پوری طرح روح اور جسم کا بلیدان دے کر اپنی کاروباری ساکھ کو بچانے کی تگ ودو میں مصروفِ عمل نظر آتی ہے دوسری طرف ایک متضاد لیکن اس طبقے کے نمائندہ کردار کو وحشی صفت کردار کی شکل میں پیش کیا ہے۔ جسے نہ تو معاشرے کے رشتوں کی اہمیت کا احساس ہے اور نہ ہی سماج کے اصولوں اور قواعد وضوابط کا۔وہ ہر طرح سے ایک انوکھی دنیا کا باسی دکھائی دیتا ہے جسے معاشرے کے ہر فرد سے اور ایک اعلیٰ مقام سے مالی اور مادی فائدے کی تمنا اور آشا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں عوام کو سماج میں نئی ترجیحات کو متعین کرنے پر مجبور کرتا ہے۔افسر شاہی سے متعلقہ مسائل کے ضمن میں ذفیرہ احمد کا عدم اطمینان کی بدولت ردِ عمل میں آجانا بعید از فہم نہیں اور کسی وضاحت کا محتاج بھی نہیں نظر آتا۔دیکھا جائے تو یہاں بنیادی مسئلہ وہی معاشرے اور معاشرتی مسائل کا ہی آتا ہے۔ذفیرہ احمد کا سماجی استحصال کیا جارہا ہے،اسے تو کوئی وجہ بتائی جارہی ہے اور نہ کوئی قصور۔وہ مسلسل سازشوں کی دلدل میں دھنستی جارہی ہے لیکن یہاں کسی بھی لمحے وہ اعتماد اور بھروسہ حاصل کر سکتی ہے بلکہ ایک سماجی بحران اور استحصال کی کیفیت سے ہمہ وقت دوچار ہے۔ناکامی کا احساس اور ذہنی حقائق سے ہو جانے والی تصدیق اس کے باطن میں مایوسی کو جنم دے کر اور پروان چڑھا کر ایک غیر معمولی ردِ عمل دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

یہاں یہ وضاحت کرنا ازحد ضروری ہے کہ دور غلامی کی افسر شاہی کا تسلسل ہماری عصر حاضر کی افسر شاہی کی صورت میں موجود ہے جو کہ رعب ودبدبہ کا پیکر ہے۔یہی رعب ودبدبہ اور طاقت بڑے صاحب کے اختیارات کی شکل میں عیاں ہے جو زفیرہ احمد کے گرد سازشوں کا ایسا جال بنتا ہے کہ جس کی وجہ سے وہ معاشی بدحالی اور بے یقینی کی کیفیت سے دوچار تھی اور وہ اپنے مفادات کے حصول کے لیے سینکڑوں فتنوں اور ہتھکنڈوں کو پروان چڑھا رہا تھا۔مذکورہ سطور میں اس کی عکاسی ملاحظہ ہو جو کہ اس نظام اور درپردہ طاقت تک رسائی سے واقفیت اور اس کی پیش کش کی خوبصورت مثال ہے:

''لیکن اس بھڑوے کی اطلاع پولیس کو دینے کی کیا ضرورت تھی؟''

''تو کیا یہ خبر آپ تک بھی پہنچ چکی ہے؟''

زفیرہ کو اپنی آواز میں کپکپاہٹ چھپانی مشکل ہو رہی تھی۔

''اوہ میری جان۔۔۔۔۔لگتا ہے تم ابھی تک مجھے نہیں جان پائی۔۔۔۔۔۔میرے
ہاتھ چھوٹے سہی مگر میری مار بہت دور تک ہے۔جس قسم کا بزنس تم جس طریقے
سے کر رہی ہو ناں۔۔۔۔۔۔ویسے نہیں ہوتا۔''(۳۴)

ناول ہذا میں جبلت و فطرت کے برعکس ترجیحات کا تعین دورِ حاضر کے بنیادی مسائل کی عکاسی ہے۔دوسرے کردار بھی غیر محسوس طریقے سے استحصال میں استحصال پسند طبقے کا ساتھ دیتے ہیں کیونکہ استحصال پسند طبقے نے لمحہ موجود اور مستقبل کے حوالے سے سہانے خواب دکھا کر اس کو اپنے ساتھ شامل کر لیا ہے۔بڑے صاحب کا سازشی رویہ توہین آمیز اور تحقیر آمیز ہے جو ایک طرف تو ذفیرہ احمد کو معاشرتی تنہائی میں مبتلا کر دیتا ہے تو دوسری طرف وہ نفسیاتی طور پر کسی پر اعتماد کرنے کے قابل نہیں ہے۔زیرِ نظر ناول میں افسر شاہی کی قباحتوں کے مسئلے کو پورے سماج اور دولت مند طبقے کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ناول نگار نے زیرِ نظر ناول میں تذلیل انسانیت،توہین آمیز رویے اور جانوروں سے بھی بدتر سلوک اور معاشرتی استحصال کے پس منظر میں افسر شاہی کی بدعنوانیوں کو بنیاد بنایا ہے۔بڑے صاحب کے اندازِ استحصال کے پیچھے صدیوں پرانی وہ طبقاتی تقسیم ہے جس کی بنیاد معاش اور مرتبے پر قائم ہے اور جس کی وجہ سے اعلیٰ طبقہ،ادنیٰ طبقے کا ذہنی،تہذیبی اور سماجی استحصال کر رہا ہے۔بڑے صاحب اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے نسوانی کردار ثنیعہ کو بھی آلہ کار کے طور پر استعمال کرتا ہے اس پیشکش میں ہر کردار کی داخلی خود کلامی اور گفتگو اس کی ترجیحات کو سامنے رکھ کر نظر آتی ہے۔اب وہ ذفیرہ احمد کے ذریعے ثنیعہ کا استعمال بھی کر رہا ہے۔مرکزی کردار بڑے صاحب نے پورے وجود کے ساتھ ناول کی فضا کو مغلوب کیا ہوا ہے۔اپنی ذات اور طبقے کے رویے سے متعلق سوالات کے خود جوابات دیے ہیں لیکن بڑے صاحب کا یہ انداز اور اطوار حقیقت پر مبنی ہیں۔اس موجودہ دور اور طبقے کے مزاج کے عین مطابق بھی ہے۔استحصال کا ادراک،ذات کا احساس اور خودداری کتنی اور کہاں تک ہے اس اقتباس سے ظاہر ہے۔زفیرہ احمد اب بڑے صاحب کی سماجی کمینگیوں اور زندگی کے ہر شعبے تک پھیلے ہوئے نفوذ و اثرات کی بدولت سازش کی دلدل میں مکمل طور پر پھنس چکی تھی جس سے فرار حاصل کرنا قطعی ناممکن تھا۔یہ ہمارے معاشرے میں افسر شاہی کے استحصالی رویے اور ذاتی مفاد کی ترجیحات کی بھرپور عکاسی ہے۔بڑے صاحب بھی زفیرہ احمد کو استعمال کر کے اپنے ذاتی مفادات کے حصول کو ممکن بناتا ہے۔ استحصال کا ادراک،ذات کا احساس اور خودداری کتنی اور کہاں تک ہے اس اقتباس سے ظاہر ہے:

''زفیرہ احمد نہایت صراحت سے جان چکی تھی کہ راؤ صاحب کی ثنیعہ کے بارے فرمائش تو محض ایک جھانسا تھی جب کہ اصل کھیل تو بڑا صاحب اس کے حصول کا کھیل رہا تھا۔اس گیم کی آڑ میں اگر وہ راؤ صاحب کو خوش کر کے کوئی اور کام نکلوانا چاہتا ہو تو کیا کیا جا سکتا ہے کہ جس عذاب میں وہ پھنس چکی تھی اس سے نکلنے کے لئے مزید ہاتھ پاؤں مارنا خود کو دلدل میں دھکیلنے کے مترادف تھا اور اس کا ہلکا سا ٹریلر اس نے پولیس رپورٹ کی صورت دیکھ لیا تھا۔''(۳۵)

بڑے صاحب نے اپنے مقاصد کے حصول اور روایتی رعب اور دبدبہ برقرار رکھنے کے لیے سازشی ہتھکنڈوں کا استعمال ضروری سمجھا جو کہ ایک مقتدر طبقے کے فرد کے لیے مؤثر ہوتے ہیں۔ناول میں اس پہلو کو بھی بڑے عمدہ انداز میں ابھارنے کی سعی کی گئی ہے کہ افسر شاہی کی نوآبادیاتی سوچ اور ہتھکنڈوں کے شکار افراد نسل در نسل بدحالی اور محرومیوں سے گزرتے رہتے ہیں، محمد حفیظ خان کا ناول افسر شاہی نظام کے خلاف ایک بھرپور اور توانا آواز ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں اس نظام کے خلاف احتجاج دکھائی دیتا ہے۔وہ اس نظام کے تحت سرکاری افسران کو حاصل ہونے والے جبر پر مبنی اختیارات کے خلاف ہیں۔اس نظام کی وجہ سے عام معاشرے میں سازشی بنیادوں پر تعصب کی بڑی خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔افسر شاہی کے بدعنوانیوں پر مبنی رویوں اور استحصال کے سلسلے میں وہ اپنے نظریات کا پرچار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں استحصال کے خلاف سراپا احتجاج کردار چاہے وہ کمزور ہوں یا طاقت ور، ملتے ضرور ہیں۔ناول ہذا میں ثنیعہ، ماہین اور ذفیرہ احمد جیسے کردار اس نقطہ نظر کی مثالیں ہیں۔محمد حفیظ خان ایسے حالات میں کرداروں کی مدد ضرور کرتے ہیں۔ناول کا موضوع بنیادی طور پر سماجی نوعیت کا ہے۔مقتدر طبقے کے اثر ورسوخ کے نتائج اور اس نظام کے تحت ہونے والے فیصلوں کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ذفیرہ احمد کی کاروباری ساکھ کی تباہی، اس کی ناموری اور عزت و تکریم کے استحصال کی داستان خود اس کی اور کچھ تقدیر کی تشکیل کردہ ہے لیکن وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سب کچھ کرنے پر مجبور ہے۔اس عہد میں انصاف کی فراہمی کے تمام شعبے بھی اثر ورسوخ سے دبتے دکھائی دیتے ہی۔کسی کی جرات نہیں ہوتی کہ وہ اس کے خلاف کہیں بھی کچھ کر سکے۔ناول نگار نے یہاں استحصالی قوتوں کو فرد کا استحصال کرتے ہوئے باہم متحد و متفق دکھایا ہے۔جس سے اس کا مقصود یہ ہے کہ یہ تمام

تر طاقتیں فرد کا استحصال کرتے ہوئے باہم اتحاد کا مظاہرہ کرتی ہیں، یہ طاقتیں اثر ورسوخ اور پیسے کے بل بوتے پر دوسروں کا خون چوستی ہیں۔

یہاں ایک اور پہلو وضاحت طلب ہے کہ یہ ایسا کردار ہے جو افسر شاہی اور سیاست کے گٹھ جوڑ کے خلاف احتجاج کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ مزید تقدیس کی پامالی کو برداشت کرنے کے قابل نہیں اور یہی گٹھ جوڑ معاشرتی استحصال کا سامان بنتے جارہے ہیں جو کہ ایک المیہ ہے۔ نوآبادیاتی دور کا بھی اور مابعد نوآبادیاتی دور کا بھی۔ افسر شاہی جس کو عوام کا خادم اور حقوقِ انسانی کا علمبردار ہونا چاہیے، اس کے ہاتھوں انسان اتنا مجبور اور اس کا دائرہ زیست اتنا تنگ ہونے لگا ہے کہ جس سے اس کے وجود کو بھی پامال کیا جارہا ہے۔ بڑے صاحب اور زفیرہ احمد کے مابین مکالمے کے یہ الفاظ اس استحصال کی عکاسی بھی کرتے ہیں اور اس المیاتی صورتحال کی تصویر کشی بھی:

> ''ہاں تو بڑے صاحب! کون سا آدمی توڑ کے دے رہے ہیں آپ مجھے ان تینوں میں سے اور پہنچے گا کب میرے پاس؟''۔۔۔۔۔ بڑے صاحب کے بولنے سے پہلے ہی زفیرہ بول پڑی۔
>
> ''ایسی بھی کیا جلدی! پہلے آپ تو پہنچ لو میرے پاس۔''(۳۶)

بڑے صاحب کا رویہ خالصتاً نظریاتی نوعیت ہے۔ وہ جس نظریے کا پیروکار ہے اس میں صرف اور صرف ایک ہی سوچ اور ذہنیت کو پروان چڑھایا جاتا ہے کہ اپنے مقاصد افضل و اہم ہیں۔ اس میں کچھ بھی کر گزرنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔ وہ کسی بھی صورت میں عدم تکمیل یا نامکمل ہونے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس نے کسی بھی حالت میں تکمیلی مراحل سے گزرنا ہے۔ اس کی تربیت اور ذہنیت کسی بھی صورت میں صرف اور صرف تکمیل کے گرد گردش کرتی ہے یعنی اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ ذفیرہ احمد بھی بڑے صاحب کی اس ذہنیت کی وجہ سے تذبذب کا شکار ہے کہ اس کے مقاصد کی تکمیل کیونکر ممکن ہے کیونکہ وہ بڑے صاحب کی فرمائش کے مطابق وہ خود اس کے پاس چل کر گئی تھی تو پھر ثنیعہ کا مطالبہ کس لیے۔ کیا اس کو اس کے علاوہ بھی کچھ اور چاہیے؟ لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کرتا۔ ان تمام سازشوں کے بھنور میں ذفیرہ احمد کا ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے اور اسے کہیں بھی مسئلے کے حل کا کوئی سرا نہیں ملتا۔ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کی جانے والی تربیت کے پیشِ نظر نہ تو مفاہمت کے حق میں ہے اور نہ ہی اس موجودہ مروجہ نظام کو کسی بھی مصلحت

کے سبب سمجھوتا کرنے دیتی ہے۔ وہ ان حالات و واقعات میں جامد (اسے شعور اور لاشعور کے باہمی تصادم نے جامد کر کے رکھ دیا) ذہن کے ساتھ فیصلہ نہیں کر پاتی کہ وہ اگلا قدم کونسا اٹھائے؟ کسی بھی کردار کا ایسی کیفیت سے دوچار ہونے کو ''کشمکشِ احتراز و گریز''(Avoid and Avoid Conflict) کی کیفیت کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی صورتِ حال میں فرد یا کردار کسی بھی پریشانی یا ناامیدی کا خاتمہ یا اس کا حل تلاش کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے خاتمے یا حل کا نتیجہ اس محرومی یا مایوسی سے کہیں گنا زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے یعنی کردار مسئلے کی موجودگی میں بھی بے اطمینانی اور بے یقینی سے دوچار رہتا ہے اور حل ہو جانے یا کرنے کے نتیجے میں ممکنہ بے سکونی اور بے چینی کو پسِ پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔ بڑے صاحب زفیرہ کے جنسی استحصال کو اپنی سازش کا حصہ بنا کر اپنے مفاد کے حصول کے لیے موقع اور سبب کے طور پر استعمال کرتا ہے لیکن بڑے صاحب کی سماجی حیثیت کے پیشِ نظر زفیرہ احمد کے ذہن میں بہت سے سوالات ابھرتے ہیں۔ ناول نگار نے اس کے تجسس کی تصویر کشی کچھ اس طرح کی ہے:

> ''یکایک ایک اور سوال اس کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا کہ بڑے صاحب نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ اگر اسے اس کا جسم ہی چاہیے تھا تو وہ خود اس کے پاس چل کر جا چکی تھی۔ اس نے ثنیعہ کی خواہش کسی اور کے لیے کی تو اس کی تعمیل بھی کر دی گئی تو پھر یہ سب کیوں؟ کیا بڑے صاحب کو اس کے سوا بھی کچھ چاہیے؟ اگر چاہیے تھا اس کا برملا اظہار ہوتا لیکن ایسی گھٹیا حرکت!! اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کوئی ایسا شخص جس کی نہ صرف مقتدر لوگوں بلکہ اقتدار کے راستوں تک من چاہی رسائی ہو، کیا وہ بھی کسی عورت کے ساتھ اس طرح کا سلوک کر سکتا ہے۔''(۳۷)

بڑے صاحب کی سازشوں کا جال صرف زفیرہ احمد کے گرد ہی نہیں بچھا ہوا تھا بلکہ ایک سرمایہ دار دانش سعید کو بھی اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ یوں اس ناول کا ہر کردار بلواسطہ اور بلاواسطہ بڑے صاحب کا ڈسا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سے نوآبادیاتی عہد کی وہی غلامانہ اصول و قوانین اور برتری کی ذہنیت رکھنے والی بیوروکریسی کی عکاسی ہوتی ہے۔ جو بالادست طبقات اور ذاتی مفادات کی محافظ ہے۔ اس ذہنی رویے کو ناول میں بار بار پیش کیا

گیا ہے تاہم مطالعیت (Readability) کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ دانش سعید کی سر گزشت کچھ اس طرح بیان کی ہے:

> ''سیکریٹریٹ جاتے ہوئے دانش سعید مسلسل اسی سوچ میں گم تھا کہ عبوری وزارت کا حلف اٹھانے سے پہلے بلیک ہاونڈ نے اس کی سپورٹس گاڑیوں کی پہلی درآمدی کھیپ کی آمد رکوانے کے لیے کیا کیا سازشیں نہیں کی تھیں؟''(۳۸)

مذکورہ بالا اقتباس نے ناول میں ایک فکری سطح کو اجاگر کیا ہے اور یہ فکر وجودی فکر ہے اور پورا ناول اس طرز فکر کی بازگشت ہے۔ افسر شاہی کے باطن و خارج کا ایسا بیان جو تا حال باشعور و سنجیدہ قاری کا پیچھا کرتا ہے۔ یہی وجودی فکر زیر نظر ناول کے کردار ماہین کی صورت میں موجود ہے۔ جس کے پاؤں زمین کے گہرے پاتال میں گڑے ہوئے ہیں۔ یہ صورت احوال زیادہ مکروہانہ انداز سے انسان کو وجودی فکر سے جوڑ رہی ہے۔ یہیں سے ناول کا اساسی المیہ ابھرتا ہے۔ جس سے مصنف کا ایقان اجاگر ہوتا ہے۔ بڑے صاحب کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی دانست میں ہر چیز، ہر جذبے اور ہر رتبے کو انتہا درجے میں دیکھنے کا عادی ہے۔ اس کی زد سے دانش سعید بھی نہیں بچ سکا۔ گاڑیوں کی درآمدی کھیپ کو رکوانے کی بڑے صاحب کی سازشیں اس کی اس بالادستی کی عکاسی ہیں۔ اس کے دوبارہ حصول کے ضمن میں بڑے صاحب اور دانش سعید کے مابین ہونے والی گفتگو دانش سعید کو درپیش خطرات سے متعلق سنجیدگی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دانش سعید نے بھی سرِ تسلیم خم نہ کیا۔ اس واقعہ کا احساس ابھی باقی تھا کہ اس میں مزید شدت اس لمحے آئی کہ بڑے صاحب نے ماہین کی خواہش کی۔ یہ واقعہ بھی سازش کی ایک کڑی ہے۔ جس میں انسانی اختیار یا ''غیر اختیاری افعال'' کا سبب بھی کافی مضبوط عنصر کے طور پر ابھر کر منظرِ عام پر آتا ہے۔ ابتدائی دشمنی کا جذبہ شکوک و شبہات کے مرحلے سے باہر نکل کر یقین تک پہنچ جاتا ہے کہ اس میں مفاد پرستی موجود ہے۔ ایک عام واقعہ اس کی تشویشی حالت کے سبب اسے بہت بڑا اور غیر معمولی نوعیت کا دکھائی دیتا ہے۔ اسے اپنے کاروبار، طاقت اور عہدے کے خلاف سازش ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس حوالے سے یہ دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کے مسائل کے حوالے سے انفرادی سوچ ختم ہو جاتی ہے۔ دانش سعید بھی انفرادی نوعیت کا فیصلہ کرنے سے قاصر ہے کیونکہ وہ بھی اس سماج کا ایک حصہ ہے ۔ یہی کیفیت ماہین کی بھی ہے۔ اسے اپنی زبان بند رکھ کر، اپنے کان کھلے رکھنے کی مجبوری لاحق ہو جاتی ہے۔ اس کی آسان الفاظ میں تفہیم یہ ہے کہ اعتدال کے راستے سے ہٹ جانا اور غیر لچکدار رویہ اپنانا ان کا ذاتی فیصلہ نہیں

بلکہ مجبوری بن جاتی ہے۔ محمد حفیظ خان نے اسلامی حوالے سے اپنے معاشرتی نظریات اور سماجی شعور کی عکاسی کی ہے کہ فرد کی غمگساری اور حمایت کے پیچھے عموماً مفاد پرستی کا عنصر اور غرض کا وجود کارفرما دکھائی دیتا ہے اور کوئی بھی انفرادی یا اجتماعی عمل ہنگامی ممکنہ مفاد یا طویل المدت نصب العین یا مقصد سے ماوراء نہیں ہوتا۔ بڑے صاحب کی بھی دانش سعید کی حمایت اور غمگساری اس کے مذموم مقاصد کے حصول اور مفاد پرستی سے خالی نہیں۔ ناول کا درج ذیل اقتباس بطور وضاحت ملاحظہ کیجیے:

''دانش صاحب آپ ایسا کریں کہ گاڑیوں کی تینوں کھیپ اکٹھی منگولیں۔۔۔۔ہاتھ ادھر کریں، اب ملا بھی لیں ہاتھ ہم سے، آپ بھی کیا یاد کریں گے ہماری دوستی کو۔۔۔۔ایسا ریلیف تو آپ منسٹر بن کر بھی خود کو نہیں دے سکتے۔ بڑے صاحب نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا کر دانش سعید کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبا دیا۔[۳۹]

اسی المیے کی مزید وضاحت کے ضمن میں ناول کے درج ذیل اقتباس میں مکالماتی انداز ملاحظہ کیجیے:

''کہاں بھجوانا ہے اس لڑکی کو؟'' دانش سعید کا چہرہ کھلنے کو بے قرار مگر بظاہر مضطرب دکھائی دینے کی جستجو میں تھا۔

''یہ ہوئی ناں بات۔۔۔۔پہلے آپ اپنے آرڈر کی کاپی وصول کر لیں پھر بتاتا ہوں کہ لڑکی کو کہاں بھجوانا ہے؟''[۴۰]

بیوروکریسی نہ صرف ایک شتر بے مہار کی مانند دکھائی دیتی ہے بلکہ ایک منہ زور گھوڑے کی طرح ہے جو کسی کو بھی اپنے اوپر آسانی سے قابض نہیں ہونے دیتا۔ مذکورہ بالا بیانیے کو ذہن میں رکھ کر دور حاضر کی افسر شاہی پر غور کیجیے۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار نہ صرف حال کے عکاس ہیں بلکہ مستقبل بین بھی ہیں۔ ناول کا اختتامیہ اس کا بھرپور عکاس ہے جس میں بڑے صاحب قتل کا مرتکب ہونے کے باوجود خود کو بچا لیتا ہے۔ ناول کا اختتامیہ مکالماتی اور استفساریہ انداز بیان پر مبنی ہے:

''بڑے صاحب نے اپنے ریوالور کا چیمبر کھولا، پانچوں گولیاں باہر نکالیں اور پہلے والا ریوالور ماہین کے ہاتھ سے لے کر اب اپنے والا اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بڑے

صاحب کی گیم کی تمام گوٹیاں سیدھی ہو چلی تھیں۔

''بول ری لڑکی !اب کون سی خبر میڈیا پے آنی چاہیے ؟

''کیا مطلب۔۔۔؟'' ماہین اب پوری طرح اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی۔

''مطلب یہ کہ زندگی ایک بار پھر تمھیں ففٹی پرسنٹ کی آپشن دینے کو تیار ہے۔''

''وہ کیسے ؟''

''ایک ہی خبر میڈیا پر دو طرح سے آسکتی ہے۔۔۔اور آپشن تمھارے پاس !''

ماہین نے استفسار یہ انداز میں بڑے صاحب کی طرف دیکھا۔

پہلی یہ کہ سپر گرل نیلاب نے نامعلوم حالات میں شیداگی گروپ آف انڈسٹریز کے مالک اور بزنس ٹائیکون سردار محبوب بخش کو قتل کر کے خودکشی کر لی۔''

''اور دوسری۔۔۔۔؟

''دوسری یہ کہ نیلاب نے قتل کے بعد آلہ قتل سمیت خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔''

''دوسری آپشن !یعنی نیلاب نے آلہ قتل سمیت خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔''(۴۱)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ حکومت اور اقتدار کے حصول کی یہ خون آشام بازی بے کنار ہے کہ جہاں مختلف کھلاڑی میدان میں اتارے جاتے ہیں، کھلائے جاتے ہیں اور انجام کے طور پر اپنی موت آپ ہی مار دیے جاتے ہیں۔ حکومت اور اقتدار کی ہزار سالہ تاریخ میں شاز ہی کوئی ایسا حکمران گزرا ہو جو اپنے زور بازو کے تحت تخت وتاج پر جلوہ گر ہوا ہو۔ وگرنہ ہر عہد اور ہر زمانے میں حکمرانوں کی پشت پناہی میں کسی بھی ہیتِ حاکمہ کی اثر پذیری کارفرما رہی ہے اور یہی اثر پذیری اور پشت پناہی ایک طرف تو کمزور حکمرانوں کو اپنی مرضی کے تابع کرتی رہی تو دوسری طرف اسی کے ردِ عمل میں خود حاکم کا روپ اختیار کرتی رہی۔

تشکیل پاکستان کے بعد روز اول سے ہی حکومتی امور کی انجام دہی کے لیے سیاسی نظام کے لیے ایک مشینری کا وجود ناگزیر تھا اور وہ مشینری بیوروکریسی تھی۔ بالالفاظ دیگر اصل ملکی حکمرانی سیاستدانوں کے پاس نہیں بلکہ بیوروکریٹس کے پاس تھی (اور ہے) اور پاکستانی جمہوری نظام برطانوی جمہوری نظام کا عکاس ہے۔ جس میں سیاست کے ساتھ ساتھ افسر شاہی (Bureaucracy) کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال یہ ہے کہ سیاستدانوں کی موجودگی کے باوجود افسر شاہی ہی ملکی پالیسیوں کی تشکیل کا کام کرتی ہے۔ اس سے یہ حقیقت منظر عام پر آتی ہے کہ افسر شاہی ہی کی کارفرمائی سیاسی عمل میں بھی ہے۔ در حقیقت افسر شاہی سیاستدانوں کی حرص و ہوس سے بخوبی واقف ہے اور اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے افسر شاہی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ان کا استعمال کرتی ہے اور جب تمام مقاصد حاصل کر لیے جاتے ہیں تو ان کو چلتا کر دیا جاتا ہے اور افسر شاہی وہیں کی وہیں موجود ہوتی ہے۔ اس تمام صورتحال کی عکاسی دورِ حاضر کے ادب میں بھی کی جاتی ہے۔ دوسری طرف ایک خوش آئند اور باعث مسرت بات یہ ہے کہ ہمارے معاصر ناول میں سماجی اور سیاسی زندگی کے ہر پہلو کی عکاسی موجود ہے۔ رحمٰن عباس اکیسویں صدی کے اردو ناولوں کے حوالے سے یوں رائے زن ہیں:

> ''ہمارے یہاں کہانی کو طول دینے کے لیے آس پاس کی معروف حقیقتوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت بھی آرٹ کی تاثیر کو ضائع کرتی ہے۔ دوسری طرف جو بات قابل توجہ اور باعث مسرت ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے معاصر ناول سماجی و سیاسی زندگی کی تفہیم کی کوشش کر رہے ہیں۔''(۴۲)

محمد حفیظ خان کے ۲۰۲۱ء شائع ہونے والے ناول ''نتارا'' میں متذکرہ المیے کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ زیر تحقیق ناول میں مقتدر طبقے مشمول افسر شاہی کی بیانیہ انداز میں عمل جراحی کی گئی ہے۔ نائلہ کا کردار بھی ناول کی کہانی کے تانے بانے میں کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ نائلہ غریب طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک ایسی لڑکی ہے جو مہم جوئی کا اشتیاق رکھتی ہے اور اس نے اپنی زندگی کے حوالے سے بہت بڑے خواب بن رکھے ہیں جن کی تعبیر کے لیے وہ مخدوم ناظر حیات کا انتخاب کرتی ہے۔ نائلہ یکے بعد دیگرے بہت سے لوگوں کے لیے ایک آلہ کار بن جاتی ہے جو اس کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ناول کا یہ اقتباس اس کا بھرپور عکاس ہے:

''مشن کی حکمت عملی کی رو سے نہ تو وہ ان طاقتوں کو جانتی تھی کہ جن کی آلہ کار بن کر وہ یہاں پہنچی تھی اور نہ ہی کسی از خود رابطے کی مجاز تھی۔ جو بھی ہدایات۔ جب بھی دی جانی مقصود ہوتیں کسی نہ کسی ذریعے سے اس تک پہنچادی جاتیں لیکن یہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ ایسی کوئی ہدایت کسی ٹیم ممبر کے ذریعے اس تک پہنچی ہوتی۔''(۴۳)

نائلہ مقتدر طبقات کی سازشوں کا شکار ہو کر ایک مہرے کی مانند استعمال ہوتی ہے۔ وہ یہ از خود نہیں جانتی کہ وہ کن کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنتی ہے۔ کہانی کے ہر موڑ پر ایک نیا کردار اس کے سامنے آکر اسے ہراساں کرتا دکھائی دہتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ذہنی اضطراب میں مبتلا ہو جاتی ہے لیکن وہ پھر بھی اس گتھی کو سلجھا نہیں پاتی۔ نائلہ اور اس جیسی ذہنیت رکھنے والے کردار فرحان، صباحت اور منصور قریشی ''ڈیپ اسٹیٹ'' کے مہرے بن جاتے ہیں۔ ناول کا ایک یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''نائلہ اس بارے میں جتنا سوچتی جارہی تھی اتنا ہی الجھتی جارہی تھی۔ اس کے مطابق اسے یہاں بھجوانے والے اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ اس طرح کھلے بندوں قتل کرنے کی بجائے بند کمرے کی حد تک دستگاہ رکھتی ہے تو پھر یہ کون لوگ ہیں جو نہ تو اس کے ماضی سے واقف ہیں اور نہ ہی اس کی پیشہ وارانہ مہارت سے۔''(۴۴)

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مملکت پاکستان روز اول سے ہی ذاتی مفادات کو اولین ترجیح دینے والے سیاسی قائدین کے زیرِ اقتدار رہی ہے۔ عوام الناس کی یہ بدقسمتی شمار کی جاسکتی ہے کہ ان پر ہمیشہ سے افسر شاہی، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے حکومت کی جو کہ سیاسی بصیرت سے ناواقف تھے۔ ان تمام طبقات کے گٹھ جوڑ اور سازش سے حکومتیں بنائی جاتی ہیں اور گرائی جاتی ہیں۔ ناول ''نتارا'' کی کہانی سیاسی عدم استحکام کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ ملک کی افسر شاہی (Bureaucracy)، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی نجی زندگی کی ترجیحات اور ان کی سازشوں کا راز افشاء کرتی ہے۔ ہمارے ملک کی افسر شاہی اور سیاسی قیادت اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے ایک دوسرے کے لیے باہمی تعاون کی فضا بھی قائم کرتی ہے حفیظ خان اس سازش اور باہمی گٹھ جوڑ کے حوالے سے ردِ عمل اور انتقامی رویے کی عکاسی نائلہ کی ذہنی اور دلی کیفیت کی شکل

میں یوں بیان کرتے ہیں جو کہ ہر موڑ پر ایک نئے کردار کے ہاتھوں مہرے کے طور پر استعمال کی جاتی ہے اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہے جس کو وہ ذہنی طور پر قبول نہیں کر پاتی:

''ایک بار تو اس نے سوچا کہ ابھی اٹھے اور جا کر سازش کے اس شطرنج کے سارے مہروں کے بدن کا ایک ایک مسام چیر کر انہیں حشرات کا رزق بنا دے۔ کیسی ہے یہ سازشوں کی دنیا کہ جہاں نہ تو پندار سلامت ہے اور نہ ہی گردن پر سر جو جتنا قریب ہے اس کا بھونکا خنجر اتنا ہی گہرائی میں زیادہ اترتا ہے۔''(۴۵)

افسر شاہی اور سیاستدانوں کی بدولت جنم لینے والے ان مسائل کے تجزیہ اور اس کے ممکنہ حل کے بارے میں عنایت الہیٰ ملک رقمطراز ہیں:

''اب تک بیوروکریسی کے بارے میں جو تنقید کی گئی ہے جزوی طور پر ان کی ذمہ داری سیاست دانوں پر بھی عائد کی جا سکتی ہے۔ جدید ریاست کے تصور میں انتظامیہ کا کردار یہ بھی ہے کہ قواعد و ضوابط کی پابندی نہ صرف وہ خود کریں بلکہ قواعد اور قانون کے ضمن میں ایک نگران کا کام بھی انہی کا ہے۔''(۴۶)

متذکرہ بالا تمام صورتحال کے حوالے سے ویبر کے نقطہ نظر کو عنایت الہیٰ ملک اس طرح بیان کرتے ہیں:

''ویبر کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ بیوروکریسی کو کنٹرول کرنا اس لیے بھی مشکل ہوتا ہے کہ روزمرہ کا نظم و نسق بیوروکریسی ہی چلایا کرتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سیاستدانوں کو بیوروکریسی کی راہ میں ایسی رکاوٹیں کرنی چاہیں کہ وہ انتظامیہ پر پوری طرح کنٹرول حاصل نہ کر پائیں۔ مگر وہ یہ بھول جاتا ہے کہ ترقی پذیر ملکوں میں سیاستدان اکثر اپنے مفادات کے لیے (بمقابلہ قومی مفادات) بیوروکریسی کے ہاتھوں آلہ کار بننے میں دیر نہیں لگاتے۔''(۴۷)

ہمارے مروجہ سیاسی نظام میں سیاستدانوں کی سرشت کے مطابق بیوروکریسی عوام کی خدمت کے لیے نہیں بلکہ انتظامی و حکومتی امور کی انجام دہی اور معاونت کے لیے ہے۔ ملک میں چلنے والی اکثر تحریکوں کی پشت پناہی کے لیے ناگزیر ہوتی ہے تاکہ کسی بھی تحریک کو پروان چڑھایا جا سکے۔ مخدوم ناظر حیات یہ سمجھنے سے

قاصر ہے کہ ملک میں تبدیلی کیونکر ممکن ہو سکتی ہے۔اس کے مطابق ایک ایسانیٹ ورک ضروری ہے جو کہ تمام تر ملکی تحریکوں کی پشت پناہی کر سکے۔حفیظ خاں مخدوم ناظر حیات کی ذہنی سوجھ بوجھ اور استفسار یہ کیفیت کی بدولت اس تمام تناظر کو یوں قلمبند کرتے ہیں:

> ''مخدوم ناظر حیات حیران تھا کہ ملک میں آخر کیا ایسا ہو گا کہ سب کچھ بدل کر رہ جائے گا۔اگرچہ اس کے سامنے ۱۹۷۷ء کی قومی اتحاد کی مثال بھی تھی مگر اس کو ایندھن تو اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے قبل از وقت انتخابات کے اعلان اور بعد ازاں شاہ سے زیادہ شاہ کے وفاداروں نے بلا مقابلہ منتخب ہو کر فراہم کیا تھا لیکن اس کے باوجود یہ سبھی کچھ کافی نہیں ہوتا۔کوئی نہ کوئی ایسی طاقت ان تحریکوں کی پشت پر ضرور چاہیے ہوتی ہے کہ جو دیا سلائی کی چنگاری کو جنگل کی آگ بنا دینے پر قدرت رکھتی ہو۔''(۴۸)

ناول میں منصور قریشی کا کردار جو ظاہری طور پر ایک قومی اخبار کا سیاسی رپورٹر ہے لیکن اپنے اثر ورسوخ کی بدولت سیاسی اور صحافتی دونوں حلقوں میں ایک پراسرار اور باخبر نمائندے کے طور پر جانا جاتا ہے۔وہ مخدوم ناظر حیات کو مستقبل میں اس کے وزیر اعظم بننے اور اس سے متعلقہ تمام تر اطلاعات فراہم کرتا ہے۔لیکن مخدوم ناظر حیات یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ یہ اطلاعات کس کی طرف سے منصور قریشی اور نائلہ کی وساطت سے اس تک پہنچائی جاتی ہیں۔سری لنکا سے واپسی پر منصور قریشی مخدوم ناظر حیات کو اس کی رہائشگاہ تک لانے اور اس کو وہاں مقید کرنے پر مامور کر دیا گیا تھا۔مخدوم ناظر حیات عجیب سے تاسف کا شکار تھا کہ آخر یہ سب کچھ اس کے ساتھ کیونکر کیا جا رہا ہے۔اس صورتحال کے پیش نظر وہ خاصی برہمی کا اظہار کرتا ہے اور اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش میں سرگرداں دکھائی دیتا ہے۔جس پر منصور قریشی اس کی اس کیفیت کو سمجھتے ہوئے اس پر کئی راز افشاء کرتا ہے۔مثال کے لیے ناول کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''اب کی بار بادشاہ گروں نے بطور متبادل وزیر اعظم آپ کا چناؤ اسی روز کر لیا تھا جب موجودہ وزیر اعظم اس منصب کے لیے امیدوار بن کر آئے۔جبکہ متوازی اسٹیبلشمنٹ یعنی بیوروکریسی نہیں چاہتی کہ آپ متبادل امیدوار ہوں لہذا غور و فکر کے بعد ان کے ہاں طے ہوا کہ آپ کو جسمانی طور پر ختم کرنے کی بجائے کردار کشی

کے ذریعے منظر عام سے آؤٹ کر دیا جائے لیکن بادشاہ گر ہر صورت آپ کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔"(۴۹)

مخدوم ناظر حیات کا بیٹا ہادی حیات اور بیوی سلمیٰ حیات اپنے باپ اور شوہر کی جان کے درپے ہوئے تھے تاکہ سیاسی ہمدردی کے حصول کو ممکن بنا کر سیاسی اقتدار اور حالیہ الیکشن کے انعقاد کو ممکن بنا سکیں۔اسٹیبلشمنٹ اور بیوروکریسی ان دونوں کے عزائم سے بخوبی واقف تھے جس کی خبر ان دونوں کو نہیں تھی۔یہ تمام احوال و آثار منصور قریشی مخدوم ناظر حیات تک پہنچاتا ہے:

"مزے کی بات یہ کہ وہ دونوں شاید ایک دوسرے کے ارادوں سے واقف ہوں نہ ہوں لیکن اسٹیبلشمنٹ اور متوازی اسٹیبلشمنٹ دونوں ان کی ہر چال سے بخوبی باخبر ہیں۔"(۵۰)

باوجود اس کے کہ مخدوم ناظر حیات اس کو ذہنی طور پر قبول کرتا وہ اس صورتحال کو منصور قریشی کی طرف سے من گھڑت کہانی قرار دیتا ہے کیونکہ یہ اس کے لیے ایک غیر یقینی امر ہے کہ اسٹیبلشمنٹ اور بیوروکریسی اس کی جان بچانے میں سرگرداں ہیں۔اس کو مخدوم ناظر حیات کچھ اس طرح بیان کرتا ہے:"اور میں نہیں مانتا کہ میرے لیے اسٹیبلشمنٹ یا بیوروکریسی اس قدر سردردی کر رہی ہوں گی۔"(۵۱)

ناول کی کہانی میں سازشوں کا جال ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ایک ایسا نیٹ ورک سرگرم عمل ہے جو ملک میں سیاسی عدم استحکام پر مامور کیا گیا ہے۔سازشوں کے اس جال میں مقتدر طبقات اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سیاستدانوں کو بلیک میل کر کے سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف عمل ہیں۔مسلمانوں کی تاریخ میں ازل ہی سے اقتدار کی رسہ کشی موجود ہے۔حکومتیں گرانا اور کمزور کرنے کی سازشیں بدقسمتی سے حکمرانوں کا شیوہ رہا ہے۔ناول میں بھی مخدوم زادہ ہادی حیات اپنے باپ اور خاندان کے ساتھ ہونے والی سازش کو بھانپ جاتا ہے۔اس پس منظر کی عکاسی ناول میں اس اقتباس سے مکمل طور پر عیاں ہے:

"ایک عام سا ممبر پارلیمنٹ جو کبھی ڈھنگ سے قومی اسمبلی یا سینٹ میں اپنے حلقے کی نمائندگی ہی نہیں کر سکا کیوں کر اور کیسے اس ملک کو چلائے گا۔اس کے پس منظر میں ضرور کوئی سازش ہے۔"(۵۲)

انہی سازشوں کے جال کی ایک اور کڑی مخدوم ناظر حیات کی جانب سے ''فارورڈ بلاک'' کا بننا ہے۔ عموماً یہ قیاس کیا جاتا ہے یہ فارورڈ بلاک ایسے ممبروں کی جانب سے وقوع پذیر ہوتا ہے جو عدم توجہی کا شکار ہوتے ہیں اور اسے توجہ دلاؤ نوٹس کے طور پر بناتے ہیں۔ اس فارورڈ بلاک کی جانب سے موجودہ وزیر اعظم کو مستعفی ہونے پر زور دیا گیا تھا۔ مخدوم ناظر حیات کی طرف سے وزیر اعظم کو مستعفی ہونے کے لیے اڑتالیس گھنٹے کا وقت دیا گیا تھا۔ تاہم معینہ مدت ختم ہونے میں چند منٹ باقی تھے لیکن حکومتی حکمران کی جانب سے کسی بھی قسم کے عمل کا مظاہرہ نہ ہوا۔ ہر کام معمول کے مطابق رواں دواں تھا۔ ان تمام حالات پر میڈیا کی جانب سے تجزیاتی عمل بھی جاری تھا۔ جس میں ماہرین کی جانب سے مختلف آراء سامنے آرہی تھیں:

> ''جونہی الٹی میٹم کا وقت ختم ہوا ٹاک شوز میں اب اس کی آئندہ کی حکمت عملی پر بحث چھڑ گئی۔ کسی کے نزدیک بیوروکریسی کی جانب سے شروع کرایا گیا کھیل زیادہ دیر چل نہ سکا اور اپنی ہی موت سے خود ہمکنار ہو گیا۔''(۵۳)

مذکورہ بالا اقتباس اس صورت احوال کی غمازی کرتا ہے کہ مخدوم ناظر حیات کسی مقتدر طبقے یا طاقت کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے جو اسے ایک مہرے کی طرح استعمال کر رہے ہیں۔ اس تمام کھیل سے وہ خود بھی بے خبر ہے لیکن مختلف آلہ کاروں کے ہاتھوں نہ چاہتے ہوئے بھی استعمال ہو رہا ہے۔ اقتدار اور اس کے حصول کے لیے کارفرما قوتوں کی یہ راہ و رسم صرف یہاں تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کا دائرہ کار نہایت وسیع ہے جو کہ مخدوم ناظر حیات کی سوچ سے بالاتر ہے جس کا اظہار وہ خود ان الفاظ میں کرتا ہے:

> ''میں تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ کون لوگ ہیں جو مجھے یہاں گھسیٹے پھر رہے ہیں۔ میرے سامنے تو آپ دونوں کے چہرے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''(۵۴)

تاریخ کی ورق گردانی سے زمانہ قدیم سے یہ اصول کارفرما رہا کہ تاریخ میں بعد از تشکیلِ ریاست متعدد اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ یہ تمام ادارے اقتضائے وقت کے تحت وجود میں آئے۔ ان میں پیشہ ور افراد کی شمولیت سے ریاست میں سیاسی استحکام ممکن ہوا۔ نتیجتاً صاحب اقتدار افراد کی زیادہ اہمیت نہ رہی۔ تاہم صاحب اقتدار افراد اس کوشش میں رہتے ہیں کہ وہ ان اداروں پر اپنا تسلط قائم کر سکیں۔ بقول ڈاکٹر مبارک علی:

''جب ادارے با عمل ہوئے تو ان کی وجہ سے صاحب اقتدار افراد کی زیادہ اہمیت نہ رہی۔ اگر اقتدار میں ذہین افراد کی جگہ اوسط ذہن کے لوگ بھی آجائیں تو ادارے ریاست کو چلاتے رہتے ہیں۔ صاحب اقتدار ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اداروں پر قبضہ کر کے ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کریں۔''(۵۵)

لیکن اگر ادارہ جاتی سطح پر غیر تربیت یافتہ افراد آجائیں تو اس صورتحال میں ادارے صاحب اقتدار افراد کے زیر تسلط آجاتے ہیں۔ نتیجتاً ریاستی مفادات کی بجائے ذاتی مفادات کی ترجیحی بنیادیں مستحکم ہوتی ہیں۔ ان اداروں میں افسر شاہی کا کردار بھی کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی صورتحال نوآبادیاتی عہد کے بعد مابعد نوآبادیاتی عہد یعنی عصر حاضر میں بھی نظر آتی ہے۔ زیر جائزہ ناول کے ناول نگار چونکہ اس نظام کے رکن رہ چکے ہیں اسلئے اس امر کے تمام جزوی و کلی طور پر تمام پہلوؤں کی عکاسی فرضی کرداروں کی صورت میں کی ہے۔ منصور قریشی اور مخدوم ناظر حیات کے مابین ہونے والی گفتگو اس امر کی عکاسی ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''ریاست اپنے مستقل اداروں سے استقامت پاتی ہے۔ انتظامیہ، عدلیہ اور فوج ریاست کی نگہبانی کرتے ہیں۔ انتظامیہ یا نوکر شاہی ریاست کے استحکام اور اس کے تحفظ کو یقینی بناتے ہوئے بدلتی ہوئی حکومتوں کے درمیان اقتدار کی منتقلی میں نہایت غیر جانبداری سے سہولت کار کے فرائض سرانجام دیتی ہے لیکن ہمارے ہاں کیا ہوا؟ ہمارے ہاں تو اہل سیاست نے انتظامیہ کو اس طرح کرپٹ کیا کہ اپنا ذاتی ملازم بنا لیا اور پھر وہی انتظامیہ جسے ریاست کا وفادار ہونا چاہیے تھا سیاست دانوں کی وفادار ہو کر ریاست کی جڑیں کھوکھلی کرنے لگی۔ ایسے میں جو خلا نوکر شاہی یا انتظامیہ پیدا کرتی ہے اسے پر کرنے کے واسطے دوسرے ادارے حرکت میں نہ آئیں تو کیا خاموشی سے ایک طرف بیٹھ کر ریاست ٹوٹنے کا نظارہ کرتے رہیں۔''(۵۶)

خالد فتح محمد نے سیاسی و سماجی شعور سے مزین ناول 'پری' میں سیاسی و معاشرتی اور افسر شاہی نظام کی بدعنوانیوں کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔ اس میں انہوں نے اکیسویں صدی کے حالیہ سیاسی، سماجی حالات اور افسر شاہی کے استحصال کو موضوع سخن بنایا ہے اور اس مروجہ نظام کی سازشوں کے معاشرے پر

اثرات کو واضح کیا ہے اور سیاست کے ضمن میں ایک نئے نقطہ نظر کو بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ ناول میں انہوں نے مارشل لا اور آمریتی دور کی عکاسی بھی کی ہے۔ افسر شاہی کی سازشوں کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> ''بیوروکریسی دو متوازی سمتوں پہ چل نکلی کیونکہ ان کے ساتھ اب فوج بھی شامل تھی۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں حکومتوں کو چیدہ چیدہ نشستوں پر دھاندلی کی تجویز دے کر عمل درآمد کیا۔ بعد کے عوامی ردِ عمل کے بعد نہ صرف حکومت چلتی کی بلکہ پھانسی سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔''(۵۷)

خالد فتح محمد نے اس ناول میں سیاسی و معاشرتی بے ضابطگیوں اور افسر شاہی کی بے اعتدالیوں پر جرات مندانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ عبدالمجید پری اور معظم علی خان کو پاکستانی افسر شاہی کی ریشہ دوانیوں کو ماضی کے اوراق کی آنکھ سے دکھاتا ہے۔ ناول نگار نے یہاں عبدالمجید کے ذریعے سیاسی و انتظامی نظام کے دونوں رخ دکھائے ہیں۔ ایک یہ کہ مقتدر طبقے کی بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگل جاتی ہیں اور فوج اور افسر شاہی عام طبقے کے لوگوں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ تصویر کا دوسرا رخ دیکھا جائے تو منظر اس کے برعکس دکھائی دے گا کہ وہ اپنے مفاد کے لیے قوانین و ضوابط کی پرواہ کیے بغیر حکومتی نظام میں حکمرانوں کو اپنی راہ سے بھی ہٹانے سے گریز نہیں کرتیں تاکہ اپنی اجارہ داری قائم رکھ سکیں۔ یہاں یہ صورتِ احوال مکالماتی انداز میں بیان کی گئی ہے۔ تمام کرداروں کے مکالمے ان کی ذہنی سطح کے عین مطابق ہیں اور ان کی گفتگو سے ان کے کردار کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ یہاں سماج کے افراد اور سرکاری اداروں کا اثر و رسوخ کافی حد تک غالب نظر آتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ استحصال کی حدود کو چھوتا ہے۔ ناول ہذا میں افسر شاہی کو سماج کے دیگر پہلوؤں کے ساتھ ساتھ سیاسی سطح پر بھی کافی طاقت ور دکھایا گیا ہے۔ اس طاقت کو دوسرے اعلیٰ طبقات کی مکمل حمایت حاصل نظر آتی ہے۔ مکالمے میں موجود سوالات یا اس کے بعد کے سوالات سے قیاس کرنا کوئی پیچیدہ عمل نہیں ہے کہ یہ ایک حساس نوعیت کا معاملہ ہے جس کی تفتیش سی ہوتی محسوس ہو رہی ہے۔ کرداروں کے اس استفسار یہ مکالمے میں سوال پوچھنے والے اور پھر جواب دینے والے ایک دوسرے کی نفسیات، شب و روز، عادات اور سب سے بڑھ کر فطری عوامل سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ کہیں کوئی سوال نہ پوچھا جائے اور کسی سوال کا جھوٹ پر مبنی جواب دیا جائے۔ مرکزی کردار روبرو جس طرح تجسس بھرے انداز میں طنز کا سہارا لیے ہوئے سوال پر سوال پوچھتا ہے اس سے اس کی ذات کا افسر شاہی اور سیاست

کے نظام سے واقفیت حاصل کرنے کے تجسس کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔ عبدالمجید اس کے تجسس کو بھانپتے ہوئے تاریخی انداز میں تمام تر عیوب و محاسن اس کے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔ ناول کی فضا کرداروں کے المیاتی اور تجسس سے بھرپور ہے اور عبدالمجید، پری اور معظم علی خان تینوں کردار اپنے ذہنی تجسس کے سبب سوال کا جواب تلاش کرتے اور دیتے نظر آتے ہیں۔ معظم علی خان کے سوال اور عبدالمجید کے جواب کے لیے پری بے چین رہتی ہے۔ انہیں سوالات اور جوابات میں افسر شاہی مفاد پرست ذہنیت اور سازش کی مختلف گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ ناول کا ایک اقتباس عبدالمجید کے جواب کی شکل میں وضاحت کے لیے ملاحظہ کیجیے:

> ''جیسا کہ میں کئی دفعہ بتا چکا ہوں کہ بیوروکریسی کا سب سے کارآمد ہتھیار جوڑ توڑ ہے۔ یہ Survival میں یقین رکھتی ہے۔ انہوں نے ہر دور میں آگے کے پائدان تک پہنچنا ہے۔ چنانچہ ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جب ان کی وفاداری اپنے ذاتی ارتقاء کے علاوہ کہیں نہیں ہوتی۔ اپنے مفاد کے تحفظ میں یہ ہر نظریہ قربان کر سکتے ہیں۔''(۵۸)

ہماری افسر شاہی کے ذہن کا سانچہ نوآبادیاتی عہد کی ذہنیت سے تیار ہوا ہے۔ وہ اپنے مفاد کے حصول کے لیے اصول و ضوابط اور نظریات کو ردّ یا نظر انداز کر دیتی ہے۔ خالد فتح محمد یہاں نہ صرف حکومتی نظام کی تشکیل کو پیش کرتے ہیں بلکہ افسر شاہی کے منافقانہ رویے اور سازشوں کو طشت از بام کرتے ہیں۔ عبدالمجید کے ہاں تاریخی بیانیہ نہ صرف افسر شاہی کی کھوکھلی رواداری اور نام نہاد روشن خیالی کی تصویر کشی کی گئی ہے بلکہ اس کے اندر کی منافقت کو بھی منظر عام پر لاتی ہے۔ اس ناول میں سیاسی حوالے سے تمیز و تفریق اور اس کے نتیجے میں پروان چڑھنے والی استحصالی نفسیات کی بھی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ خالد فتح محمد خان نے اس مقتدر طبقے کی ناموری، شہرت اور خدمت گار ہونے کے دعوے کو سراسر منافقت قرار دیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ یہ طبقہ جب کوئی سازش کرتا ہے تو اسے اپنی سازش کو مخفی رکھنے کا فن آتا ہے۔ افسر شاہی میں سرکاری امور کی انجام دہی کے معاملے میں کافی حد تک بدعنوانی موجود دکھائی دیتی ہے۔ یہ سب کچھ عبدالمجید کی زبانی بیان کیا گیا ہے۔ نوآبادیاتی عہد میں بھی اس طرح کے ادارے عموماً بدعنوان لوگوں کے ہاتھوں میں تھے۔ یہ لوگ جس قدر بدعنوانی کے مرتکب ہوتے اسی قدر کمپنی سرکار اپنے آپ کو محفوظ و مامون خیال کرتی کیونکہ یہی لوگ مشکل حالات میں کمپنی سرکار کو سہارہ دیتے یعنی عوامی سطح پر کسی بھی طرح کے شر کو رفع کرنے کی صلاحیت

رکھتے۔مابعد نوآبادیاتی عہد میں بھی ایسے ہی لوگوں کی ذہنیت کا ناول میں پردہ فاش کیا گیا ہے۔خالد فتح محمد کا اس ضمن میں تاریخی واقعہ ملاحظہ ہو جو اس ناول کے مرکزی موضوع 'سازش' اور 'سماجی استحصال' کے گہرے تعلق کو واضح کرتا ہے:

> ''برِصغیر کی تقسیم کے وقت قائدِاعظم کے علاوہ تمام سیاستدان نوآموز یا نو وارد تھے۔ہمارے حصے میں آنے والی بیوروکریسی راج کی تربیت یافتہ تھی اور یہی حال افواج کا تھا۔سیاست دان شاید ملک میں کسی قسم کا نظام ترتیب دینا چاہتے تھے لیکن بیوروکریسی نے راہ میں روڑے اٹکائے۔ملک میں دو ایسے قوانین لاگو کیے گئے جن کا کوئی منطقی یا سیاسی جواز نہیں تھا سوائے وقتی فائدے کے۔''(۵۹)

خالد فتح محمد نے اس مقتدر طبقے کے حیلے یا جواز کو پیش کیا ہے جو نچلے طبقے کے استحصال کو خفیہ یا اعلانیہ پیش کرتے ہیں۔یہ طبقات نہ تو نچلے طبقے کے استحصال پر شرمندہ ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں اپنے کیے کا ادراک ہوتا ہے۔یہ سب کچھ انہیں قانونِ فطرت نظر آتا ہے کہ خدا نے انہیں طاقتور بنا دیا اور نچلا طبقہ ان کے استحصال کے لیے کمزور۔خالد فتح محمد نے سماجی استحصال کے تناظر میں سازش، منافقت اور نام نہاد تہذیب یافتہ کہلائے جانے کے ساتھ ساتھ موجودہ دور کے سیاسی نظام کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ طبقاتی تفریق اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ سماجی و انتظامی باگ ڈور چونکہ طبقہ اشرافیہ کے ہاتھ میں رہی ہے اس لیے مقتدر طبقے کے ہاتھوں نچلے طبقے کا استحصال ہوتا رہے۔زیرِ جائزہ ناول سماجی و سیاسی مسائل اور افسر شاہی کے ہاتھوں استحصال کے حوالے سے اپنے موضوع اور معنویت کے اعتبار سے ایک الگ ناول ہے۔سماج میں طبقاتی فرق، اونچ نیچ اور طبقہ اشرافیہ کے ہاتھوں نچلے طبقے کے استحصال کے مسائل قدیم دور سے رائج رہے ہیں۔افسر شاہی وہ طبقہ ہے جس نے اپنے قدیم یا ابتدائی دور سے تاحال سماج کے اعلیٰ مقام یا حیثیت پر قبضہ کیا ہے۔سیاسی نظام میں اسے حکومتیں بنانے اور حکومتیں گرانے میں ایک اہم ستون خیال کیا جاتا ہے جس کا فوج اور سیاستدان بھرپور استعمال کرتے ہیں اور عوام کے مفادات کو پسِ پشت رکھا جاتا ہے۔خالد فتح محمد نے یہاں فوج، سیاستدانوں اور افسر شاہی کی عیاری، مصلحت اور تکبر کو پیش کیا ہے۔اس طرح کے مختلف نوعیت کے متعدد واقعات طبقے کی بنیاد بنتے رہے ہیں۔جس میں عوام کو سرے سے معاشرے کا حصہ ماننے سے انکار کیا جاتا ہے اور ان کا انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر موقع حاصل کرنے پر ہر حوالے سے استحصال کیا جاتا رہا ہے۔یہاں افسر شاہی کی اجارہ داری نے عوامی سطح

پر قانونی و ریاستی نظریات کو بحران سے دوچار کر دیا تھا۔ یہ طبقہ من چاہے اصول و قوانین بناتا۔ طبقاتی تفریق کو پروان چڑھایا جاتا اور طبقاتی بنیاد پر سرکاری قوانین وضوابط میں ترمیم و تخفیف بھی کی جاتی تھی۔ خلاصہ یہ کہ افسر شاہی اور اس سے منسلک اعلیٰ طبقات کو معاشرے پر مکمل گرفت حاصل رہی۔ افسر شاہی کے اس اندازِ گرفت نے نہ صرف سماجی سطح پر بلکہ قانونی سطح پر بھی افراد کی زندگیوں کو بحرانی کیفیت سے دوچار کیا۔ یہ مقتدر طبقہ استحصال کی حد تک مفادات حاصل کرتا رہا۔ افسر شاہی کے اس تصور اور اندازِ پیشکش نے المیے کی صورت اس وقت اختیار کی جب سیاسی قوانین نے حکومتوں کو گرانے میں سازشی عمل کو خوب بڑھا چڑھا کر استعمال کیا۔ ناول نگاران حوالوں سے کچھ اس طرح کا تجزیہ پیش کرتے ہیں:

> ''یہاں تین عوامل بہت اہم رہے ہیں۔ فوج، بیوروکریسی اور سیاستدان۔ اہم ترین عمل یعنی عوام کو Have Nots میں گردانا جاتا تھا۔ فوج اور بیوروکریسی کچھ عرصہ سے متحارب رہے۔ فوج کے پاس تمام اوزار تھے۔ بیوروکریسی کے پاس ایک ہتھیار تھا اور وہ تھا جوڑ توڑ پر مبنی موقع شناسی۔۔۔۔ انہوں نے بظاہر میدان میں تولیہ پھینک کر فوج کو آگے بڑھنے کا موقع دیا مگر اپنے ہتھیار کو زنگ آلود نہیں ہونے دیا۔ چیدہ چیدہ بیوروکریٹ طاقت کے دستِ راس بن گئے۔ ان کی باقیات اب تک حکومتوں کے ہر فیصلے کو سراہ رہی ہیں۔ فوج کو ایک ایسے ادارے کی ضرورت تھی جو ہر قسم کی اطلاعات کا موازنہ کر کے ان کے نتائج حکومت کو بہم پہنچائے۔ ایسے حساس ادارے کا وجود تو تھا، اس کے دائرہ عمل کو وسیع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ ادارہ بتدریج پھلتا پھولتا رہا۔ یہاں تک کہ ملک کی سب سے طاقتور تنظیم بن گیا۔ یہ حکومت کے اندر ایک اور حکومت ہے۔ حکومتیں گرانے کے لیے اس نے راہیں ہموار کر لیں، مشہور ہوائی حادثہ اسی کے کسی شعبے کی کارکردگی ہو سکتا ہے۔ بعد کی سیاسی حکومتیں بنانے اور ان کو انجام تک پہنچانے میں اسی کا ہاتھ ہے۔''(۶۰)

زیرِ تحقیق ناولوں کے مندرجہ بالا نظریے سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو ناول نگاروں نے افسر شاہی نظام افراد کی بدعنوانی کی مختلف صورتوں کی عکاسی ایسے انداز میں کی ہے کہ جملہ قباحتیں جزیات کے ساتھ

اجاگر ہو کر سامنے آئی ہیں۔ افسر شاہی اور اس سے وابستہ مقتدر طبقات کی سماجی سطح پر کامل گرفت اور اس اندازِ گرفت کی بدولت معاشرتی اور قانونی سطح پر لوگوں کی زندگیوں کی بحرانی کیفیت کی عکاسی بھی ہوئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔حافظ محمد سعد، رشوت، ایک لعنت، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، س۔ن، ص ۲

۲۔ محمد فرید وجدی، دائرۃ المعارف القرآن العشرین، تصویر دار المعرفہ، جلد ۱۹۷۱،۴ء، ص ۲۳۱

۳۔ شیخ حسام الدین فرفور، حاشیہ ابن عابدین، جلد ۵، دار المعرفہ بیروت، لبنان، ۲۰۰۰ء، ص ۳۶۲

۴۔عبداللہ بن عبدالمحسن الطریقی (مولف)، مولانا نصیر احمد ملی (مترجم)، رشوت، ایک معاشرتی ناسور، مکتبہ اسلامیہ، ۲۰۰۵ء، ص ۶۲

۵۔ایضا، ص ۶۳

۶۔ایضا، ص ۶۳

۷۔امام ابن حزم اندلسی، المحلیٰ، مرکز الدعوۃ والارشاد، لاہور، جلد ۴، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵۷

۸۔ شیخ حسام الدین فرفور، ص ۳۶۲

9. Encyclopedia Britannica,William Benthon Publisher,P.170

۱۰۔حافظ محمد سعد، رشوت، ایک لعنت، ص ۴

۱۱۔ مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، جلد ۳، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۵۹

۱۲۔عبداللہ بن عبدالحسن الطریقی (مولف)، ص ۱۰۷

۱۳۔ سنبل نگار، ڈاکٹر، اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، زبیر بکس اردو بازار لاہور، س۔ن، ص ۲۶۱

۱۴۔ قیصر امین الدین، فکر و نظر، ابلاغ، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۷۷

۱۵۔ مخدوم زادہ سید حسن محمود، میرا سیاسی سفر، جنگ پبلشرز، ۱۹۸۶ء، ص ۱۷۶

۱۶۔عبدالرّؤف، ڈاکٹر، بدعنوانی اور رشوت ستانی۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۵۹

۱۷۔ایضاً، ص ۶۹

۱۸۔م ب خالد، قدرت اللہ شہاب کے ساتھ ایوانِ صدر میں سولہ سال، احمد پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۲۹

۱۹۔عبدالرّؤف،ڈاکٹر،بدعنوانی اور رشوت ستانی،ص۵۶

۲۰۔نطاشہ مسعود،، قالہ نگار،خالد فتح محمد کی ناول نگاری('پری'اور 'خلیج' کے حوالے سے)۲۰۰۷ءتا۲۰۰۹ء،ص ۳۹،۴۰

۲۱۔ایضاً،ص ۴۲

۲۲۔اچاریہ چانکیہ،ارتھ شاستر،شان الحق حقی(مترجم)،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی،۱۹۹۹ء،ص۹۰

۲۳۔خالد فتح محمد،پری،برائٹ بکس پبلشرز اینڈ سیلرز اردو بازار لاہور،۲۰۰۶ء،ص ۹۴

۲۴۔محمد حفیظ خان،کرک ناتھ،بک کارنر جہلم،پاکستان،۲۰۲۰ء،ص۱۹۹۔۲۰۰

25.https:// www.Collinsdictionary.com

۲۶۔اسلم آزاد،ڈاکٹر،اردو ناول آزادی کے بعد،سیمانتھ پرکاش،نئی دہلی،۱۹۹۰ء،ص۲۰۔۲۱

۲۷۔محمد حفیظ خان،کرک ناتھ،بک کارنر جہلم،پاکستان،۲۰۲۰ء،ص۳۹۰

۲۸۔مبین مرزا،مکالمہ(کراچی)،کتابی سلسلہ ۷،اکادمی بازیافت،اکتوبر ۲۰۰۰ء۔۔۔۔۔۔جون ۲۰۰۱ء،ص۳۰۱

۲۹۔ایضا،ص۳۹۰

۳۰۔خالد فتح محمد،پری،برائٹ بکس پبلیشرز اینڈ سیلرز اردو بازار لاہور،۲۰۰۶ء،ص۹۰

۳۱۔ممتاز حسین،ناول اور افسانہ،مشمولہ ۱۹۵۱ء کا بہترین ادب،برکت علی،مرزا ادیب(مرتبین)،مکتبہ اردو لاہور،اوّل،جولائی ۱۹۵۲ء،ص۱۷۴۔۷۵

۳۲۔ایضا،ص ۸۲

۳۳۔محمد حفیظ خان،کرک ناتھ،بک کارنر جہلم،پاکستان،۲۰۲۰ء،ص۵۶

۳۴۔یضا،ص ۸۴

۳۵۔ایضا،ص۸۸

۳۶۔ایضا،ص۸۹

۳۷۔ایضا، س ۱۴۱

۳۸۔یضا، ص ۳۸۱

۳۹۔ایضا، ص ۳۸۴

۴۰۔ایضا، ص ۳۸۴

۴۱۔ایضا، ص ۳۹۵۔۳۹۶

42.https://ur.m.wikipedia.org

۴۳۔ محمد حفیظ خان، منتارا، صریر پبلیکیشنز، لاہور، راولپنڈی (پاکستان)، ۲۰۲۱ء، ص ۱۱۲

۴۴۔یضا، ص ۱۳۰

۴۵۔ایضا، ص ۱۳۱

۴۶۔ عنایت الہیٰ ملک، پاکستان میں انتظامیہ کا زوال، مشعل لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۱۱

۴۷۔ایضا، س ۵۴

۴۸۔ محمد حفیظ خان، منتار، ص ۱۵۴

۴۹۔ایضا، ص ۱۶۵۔۱۶۶

۵۰۔ایضا، ص ۱۶۶

۵۱۔ایضا، ص ۱۶۷

۵۲۔ایضا، ص ۱۷۴

۵۳۔ایضا، ص ۱۸۶

۵۴۔ایضا، ص ۱۸۹

۵۵۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کی گواہی، تاریخ پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۵۷

۵۶۔ایضا، ص ۱۹۶

۵۷۔خالد فتح محمد، پری، ص۹۶

۵۸۔ایضاً، ص۹۶

۵۹۔ایضاً، ص۹۵

۶۰۔ایضاً، ص۹۱

باب چہارم

مجموعی جائزہ، تحقیقی نتائج، سفارشات

الف۔ مجموعی جائزہ

حکومت اور اقتدار کی خواہشات انسانی جبلت میں روزِ اول سے آب وتاب کے ساتھ اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہیں۔ جبلی اور فطری خواہشات دورخی پہلو کی حامل ہیں۔ جن میں سے ایک پہلو قطع نظری اور بے اعتنائی کی صورت میں موجود ہے۔ فطرت سلیمہ سے آشنائی کی صورت میں ملکوتی قوتیں انسانی اصاف کا حصہ بن جاتی ہیں۔ بصورتِ دیگر انحراف کی صورت میں استحصال اور جبر اپنا تسلط قائم کر لیتے ہیں۔ حکومت اور اقتدار کے رویے غریب طبقات پر اپنے گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کرتے چلے جاتے ہیں، دنیا کے کسی بھی سماج پر نگاہ دوڑائیں تو ہر معاشرہ طبعاً عملِ تقسیم کا پابند دکھائی دیتا ہے۔ یہی اصول مقتدر طبقات کی تقسیم پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ اقتدار اور تسلط کے ضمن میں مقتدر طبقات کو بہت سی صورتوں میں منقسم کیا گیا ہے جن میں ایک افسر شاہی (Bureaucracy) ہے۔ بیوروکریسی دو الفاظ کے مجموعے کی شکل میں قواعد، آئین و تسلط اور قوت سے عبارت ہوتا ہے۔ تاہم اس کی اصطلاحی اور جامع تعریف و توضیح میں بہت سے معنی و مطالب اخذ کیے جاتے ہیں۔ ادارہ جاتی حوالے سے افسر شاہی سرکاری عہدیداران پر مشتمل ایک ایسی حکومت ہے جو منتخب کردہ ممبران کے متوازی متصور ہوتی ہے۔ اس کی اصطلاح اس تلخ حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ بظاہر ایک نمائندہ حکومت کا وجود اپنی جگہ موجود ہے لیکن تمام تر اختیارات واقتدار سرکاری افسران کے پاس ہے۔ افسر شاہی کی اس تعریف میں بہت سے پہلو پنہاں ہیں جن کو عیاں کرنے کے لیے درج ذیل پہلوؤں کا احاطہ کرنا ضروری ہے۔

سرکاری حکام کے طرزِ رویہ اور طرزِ عمل کی نوعیت کو صفحہ قرطاس پر لانا ضروری ہے۔ اس حوالے سے افسر شاہی کے کا ایک پہلو باعثِ کسرِ شان ثابت ہوتا ہے وہ پہلو سرخ فیتے کا استعمال ہے۔ افسر شاہی پیچیدہ امور پر مبنی ایک ایسا تنظیمی ڈھانچہ ہے جو فعال کردار ادا کرتا ہے۔ یہ تنظیمی ڈھانچہ بااسلوب نظام ہونے کی بنا پر ایک تنظیم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ گزشتہ صدی کے آغاز میں ایک ماہر عمرانیات میکسمیلئین ویبر (۱۸۶۴۔۱۹۲۰) جس کا تعلق جرمنی کی سرزمین سے تھا، افسر شاہی کو ریاست کے انتظامی ڈھانچے سے منسلک تصور کرتا ہے۔ میکس ویبر نے افسر شاہی (Bureaucracy) کے مطالعے کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس

کی تفہیم اور مطالعے میں بہت سے مشاہدات کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ چونکہ میکس ویبر افسر شاہی کو تنظیمی صورت قرار دیتا ہے جہاں سرکاری افسران اپنے افعال کی کارکردگی میں سرگرم عمل دکھائی دیتے ہیں۔ ان تمام مشاہدات کا سلسلہ افسر شاہی کو تسلط اور اقتدار کی صورت قرار دینے پر منتج ہے۔ سماجی قدریں۔ انسانی قیادت اور افسر شاہی انتظامی تنظیم کے تین بنیادی عوامل ہیں۔ ان مشاہدات کے آخر میں افسر شاہی کی خصوصیات بھی مرتب کی گئیں جن کے تحت ہر کارکن کچھ اصول وضوابط کا پابند رہ کر امور کی انجام دہی کرتا ہے۔ امور کی تقسیم کار کا عمل سطح وار درجہ بندی پر منحصر ہے۔ چونکہ تمام اصول وضوابط طے شدہ ہوتے ہیں اس لیے کوئی بھی عہدیدار اپنی پسند وناپسند کی بنیاد پر تبدیلی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

ویبر نے اقتدار اور معاشرتی طبقات دونوں موضوعات کو سپردِ قلم کیا ہے۔ ویبر کے نزدیک اختیار کی تین صورتیں ہیں۔ کرشماتی اختیار، روایتی اختیار اور قانونی اختیار۔ متذکرہ تینوں اختیارات انسانی سماج میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ یہ حقیقت بھی ناقابلِ مسترد ہے کہ سماج میں جاگیردارانہ اقتدار سے قانونی اقتدار نے جنم لیا ہے۔ میکس ویبر کا یہ نظریہ عقلیت پسند تھیوری گردانا جاتا ہے جس کا اطلاق انسانی تنظیموں پر ہوتا ہے۔ اس حوالے سے فیرل ہیڈی (Ferral Heady) کی کاوشوں کو بھی نہیں بھلایا جاسکتا۔ اس نے افسر شاہی کے دو پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے جو کہ بالترتیب ساختیاتی پہلو (Structural Aspect) اور طرزِ عمل کا پہلو (Behavioural Aspect) ہیں۔ اگر حقائق پر مبنی بات کی جائے تو افسر شاہی کا طرزِ عمل بیان کردہ اصولوں سے انحراف کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے ویبر کے نظریے کو تنقیدی رویوں کا سامنا کرنا پڑا۔ افسر شاہی کو دو نظاموں میں منقسم کیا جاتا ہے جو کہ سول بیوروکریسی اور فوجی بیوروکریسی ہیں۔ یہ دونوں نظام ہنگامی حالات میں باہم مربوط دکھائی دیتے ہیں۔ سول سروس بھی افسر شاہی کا اعلیٰ عہدیداروں پر مبنی نظام ہے جو کہ میرٹ کی بنیاد پر امتحان میں کامیابی کی صورت میں منتخب شدہ ہیں۔ عمومی تاثر یہ ہی کہ افسر شاہی ایک ایسا تنظیمی ڈھانچہ ہے جس میں تکنیکی عوامل کی کارفرمائی کی بجائے سیاسی پہلو کی کارفرمائی موجود ہے۔

افسر شاہی کی تفہیم کے بعد کے ارتقائی عوامل کو جاننا بھی اشد ضروری ہے۔ اس کا آغاز تاریخ کے ازمنہ ماقبل سے ہوتا ہے جس کو یونانی فلسفی افلاطون (Plato) نے اپنی تصنیف "The Republic" میں بیان کیا ہے۔ اس کے نزدیک افراد کی لیاقت اور ذہانت انتظامی امور کی انجام دہی کے لیے ناگزیر ہیں۔ باوجود اس کے کہ اس کا مجوزہ تعلیمی وتربیتی نظام ایک مؤثر نظام متصور کیا گیا لیکن بعدازیں سرکاری دفاتر میں امور کی انجام دہی

کی رفتار کی شرح میں تعقل پیدا ہو گیا۔ اس کے نظریے کے مطابق اس مجوزہ نظام کی جڑیں اقرباپروری اور امارت کھوکھلی کر رہے ہیں۔ تاہم اس نظام کا کلی طور پر نفاذ ممکن نہ ہو سکا۔ سول سروس یا بیوروکریسی کا آغاز سومیری تہذیب سے ہوتا ہے کہ جب انسانی تاریخ میں تعلیم کا استعمال کیا گیا۔ ان کا متن پیچیدہ نوعیت کا تھا جو کہ 'کاتبین' ہی سمجھ سکتے تھے۔ یوں اس صلاحیت کی بنا پر انہیں انتظامی امور کے تمام اختیارات تفویض کر دیے گئے۔ اس اقتدار کی تاریخ کے بعد 'ہخامنشی تہذیب' میں بھی اس کا بول بالا رہا۔ اس تہذیب میں سلطنت صوبوں میں منقسم تھی۔ اس کی مناسبت سے مختلف عہدیداران کا انتخاب کیا گیا۔ اس کا ایک باقاعدہ نظام موجود تھا جس کا تذکرہ اچاریہ چانکیہ کی تصنیف ''ارتھ شاستر'' کے قدیم متن میں بھی ایک انتظامی ڈھانچے کے طور پر موجود ہے جو کہ منتظم ڈھانچہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس تصنیف کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ انتظامی ڈھانچے کو منظم بنانے لے لیے سفارشات کا اندراج بھی کیا گیا ہے۔ دورِ حاضر کی افسر شاہی میں پائے جانے والے اقرباپروری اور سفارش کے شواہد تاریخ میں بھی ملتے ہیں جو کہ تاحال بھی جوں کے توں موجود ہیں۔ عہدِ قدیم میں پبلک سروس میں افسروں کی تعیناتی کا عمل وراثتی طور پر بروئے کار لایا جاتا تھا۔ اس قسم کے طریقہ ہائے کار میں خرید و فروخت کا عنصر موجود ہوتا تھا جو کہ بعد میں رشوت ستانی کا موجب بنا۔ دورِ حاضر کی افسر شاہی (Bureaucracy) کے آثار قرونِ وسطیٰ کے 'چن خاندان' (Qin Dynasty) میں ملتے ہیں۔ کنفیوشس (Confucius)(5BC) کو چینی افسر شاہی کا اہم اور عظیم رکن متصور کیا جاتا ہے۔ اس کے تحریر کردہ متن کی خوانی لازمی قرار دی گئی۔ 'ہان خاندان' کے دورِ حکومت میں سول اور فوجی بیوروکریسی کی تقرریاں میرٹ کی بنیاد پر کی جاتی تھیں۔

برِصغیر پاک و ہند میں سول سروس کی اصطلاح برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ تسلط اٹھارہویں صدی میں منظرِ عام پر آئی جس کے پسِ پشت اپنے مفاد کا حصول تھا۔ برطانوی تسلط سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ۱۸۵۷ء میں غدر کا واقعہ ہوا جس کی ناکامی کے نتیجے میں مسلمانوں پر دائرہِ زیست تنگ ہونے لگا۔ تاہم برطانوی ناآبادکاروں کے تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی افسر شاہی کا وہی انتظامی ڈھانچہ وراثت میں ملا۔ اگر ترقی یافتہ ممالک میں افسر شاہی کا تجزیہ کیا جائے تو تمام شعبوں کی ترقی و منزلت افسر شاہی کے عروج سے منسلک دکھائی دیتی ہے۔ اس عروج کے پیچھے سول اداروں کی کارفرمائی ہے جو کہ شبانہ روز کی محنت شاقہ سے ریاست کو ترقی کی جانب لے کر جاتے ہیں۔ سول اداروں کا کردار ملکی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہے۔ قائدِ اعظم کا نقطہ

نظر بھی یہی تھا کی ملکی ترقی اور عزت و منزلت کے لیے سرکاری ملازمین کو عوام کے خدمت گار کے طور پر کام کرنا چاہیے۔اس سلسلے میں کسی بھی قسم کے دباؤ کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔سول سرونٹس کو عوام کے خدام کی صورت میں صداقت، شجاعت اور عالی حوصلگی جیسے اوصاف پیدا کرنے چاہییں چونکہ دنیا کے نقشے پر تشکیل پاکستان ایک انقلابی تبدیلی تھی جس کی انتظامیہ پر بھاری ذمہ داری تھی۔اس حوالے سے سرکاری عہدیداران کو قانونی اور عقلی اقدامات اٹھانے کی ضرورت تھی۔ سرکاری افسران کے دائرہِ اختیار میں انتظامی امور،اصول و ضوابط کا نفاذ، فنڈز کی بحالی اور تقسیم کار کا عمل شامل ہوتے ہیں لہذا ان پر دوہرے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ایک امور کی انجام دہی میں محنت اور لگن اور دوسرے بلند حوصلگی کا مظاہرہ۔ حکومتی مشینری کا نقطہ نظر لچکدار ہونا چاہیے تاکہ انقلابات کے مطابق حکمتِ عملی کو وضع کیا جاسکے۔اس وضع کردہ حکمتِ عملی سے حاصل ہونے والے نتائج کے ثمرات ملک کے اکثریتی لوگوں کے حق میں ہونے چاہییں۔بحیثیت انسان سرکاری افسران کے لیے رقیق القلبی ایک بنیادی وصف ہے۔ سرکاری عہدیدار کو اصول وضوابط کی خلاف ورزی کیے بغیر مخلصانہ اور ہمدردانہ جذبات کو بروئے کار لانا چاہیے۔افسر شاہی کی ان تمام خصوصیات کے باوجود اگر سیاسی،تاریخی، معاشرتی اور ثقافتی پہلوؤں پر نظر ثانی کریں تو اس کی قباحتوں اور خرابیوں کے ضمن میں طاقت اور علم کے باہمی گٹھ جوڑ سے اس کو تحریک ملتی ہے اور اسی حکمتِ عملی کے تحت نوآبادیاتی نظام کی ڈاغ بیل ڈلی۔اس میں سیاسی مفاد کو ترجیحی بنیاد پر رکھا گیا جو کہ کلونیل ازم پر منتج ہوئی۔اس تمام حکمتِ عملی کی بدولت قائم شدہ افسر شاہی نے اپنی حاکمیت قائم کرلی۔اسکے اراکین نے مخصوص ذہنیت اور جاگیر دارانہ نظام کی بدولت طاقت اور اختیار کا مادی اور معاشرتی استعمال کیا۔ جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کو ملٹری اور سول بیوروکریسی کی وجہ سے تقویت حاصل ہوئی۔ کیونکہ یہ دونوں نظام ملٹری اور سول بیوروکریسی کے بغیر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔یہ گٹھ جوڑ ایک منظم اور سوچی سمجھی حکمتِ عملی کے تحت قائم کیا گیا تاکہ ملکی ریاست پر اپنی اجارداری کو برقرار رکھا جاسکے۔مابعد نوآبادیاتی عہد میں اس طرز کے انتظامی ڈھانچے کا اختتام ضروری تھا کیونکہ نوزایندہ مملکت کے تقاضے بھی مختلف تھے۔ لیکن صورتحال اس کے برعکس نکلی۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح بھی اس گٹھ جوڑ کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ قائدِ اعظم نے ایک ایسی ریاست کا خواب دیکھا جہاں استحصال زدہ اور استحصال کنندہ طبقات کا کوئی وجود نہ ہو لیکن ملک کی بدقسمتی کہہ سکتے ہیں کہ قائد کی وفات کے بعد جلد ہی ان کی جماعت کی باگ ڈور فوجی اور سول بیوروکریسی کے ہاتھوں میں چلی گئی۔بعدازیں صنعتی ارتکاز کی بدولت دونوں قسم کی افسر شاہی کو مزید استحکام ملا۔مابعد نوآبادیاتی عہد میں بھی افسر شاہی نوآبادیاتی عہد کی ہی متشکل

ہے۔ حکومتی ایوانوں میں سیاستدانوں نے قیامِ پاکستان اور افسر شاہی کو مالِ غنیمت جان کر بھرپور استفادہ کیا۔ گزشتہ کافی عرصے سے افسر شاہی تنقید کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ ہر طرف سے افسر شاہی پر جمود چھایا ہوا دکھائی دیتا ہے جس کی شکایت اکثر لوگوں کی زبان پر ہے۔ افسر شاہی ایک کثیر الجہاتی فکری عمل ہے جس پر سماجی سطح پر مقتدر نظریات کی بالادستی نظر آتی ہے۔ اس بالادستی کی وجہ سے ہر طرف انتشار کی فضا قائم ہو گئی ہے۔ قباحتوں میں کچھ نقائص مروجہ نظام کے ہیں تو کہیں کچھ خامیاں افراد کی بدعنوانی کی شکل میں سماج میں پھیلی ہوئی ہیں۔ تاہم افراد کی بدعنوانی کو موضوع بحث بنانے سے پہلے اس اصطلاح سے واقفیت ضروری ہے۔ Merriam Webster میں تحریر کردہ تحاریف کے مطابق بدعنوانی کو مقتدر طبقات جن میں خاص طور پر سرکاری افسران شامل ہیں، سے منسوب کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک اور تعریف کی رو سے غیر قانونی ذرائع کی وساطت سے جرم کی طرف مائل کرنے کا نام بدعنوانی ہے۔ بدعنوانی کے تمام پہلوؤں کی عکاسی Pakistan Panel Code(XLV of 1860) کے باب نہم میں کی گئی ہے۔ حقیقت میں بدعنوانی کی کوئی بھی تعریف و توضیح ابہام سے خالی نہیں ہے۔ ایسے تمام اصول اور قوانین چاہے ان کا تعلق سرکاری امور سے ہو یا غیر سرکاری امور سے، بدعنوانی کی تعریف کو ملحوظ خاطر رکھ کر اس سے بچاؤ کی راہ تلاش کر لی جائے۔ سماجی سطح پر بدعنوانی کو بامِ عروج بخشنے کے لیے ایسے عمل کی کارفرمائی دیکھنے کو ملتی ہے جو کسی تکنیکی ذرائع کی تقلید سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ تمام صورتحال پاکستان کے تمام باشندوں کے لیے سوہانِ روح بن چکی ہے، اس تکلیف دہ امر کے باوجود ایک سوال نے انسدادِ جرائم کے ماہرین کے اذہان کو جکڑ رکھا ہے کہ جرائم کے تدارک کو اولیت حاصل ہے یا (Criminality) کو؟ مذکورہ صورتِ احوال کے تجزیے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جرائم کی دنیا کو ختم کرنے یا اس میں کمی لانے کی تمام کوششیں بدعنوانی کو جنم دیں گی۔ اس کے استدلال میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک برائی کو فروغ حاصل ہو گا جس میں سرکاری عہدیداران کے اختیارات و مراعات میں اضافے کے رجحان کا احتمال ہے جبکہ عوام الناس اپنے تحفظات اور مسائل کے حل کے لیے انہیں امیدواران کے دستِ نگر بن جائیں گے۔ نتیجتاً عوام میں خود اعتمادی کی خاصیت کا فقدان ہو گا جو کہ ایک ملک یا ریاست کو ترقی و منزلت کے اوج کمال تک پہنچانے کے تمام راستوں کو مسدود کر دیتا ہے۔ یہ کہنا بجا نہ ہو گا کہ جرائم و بدعنوانی لازم و ملزوم ہیں۔ بلکہ ایک نقطے پر جا کر دونوں باہم مدغم ہو جاتے ہیں۔ افسر شاہی میں بدعنوانی کا رجحان وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پروان چڑھا اور عہد حاضر میں بھی اس کے اثرات موجود ہیں۔ قدیم عہد کی سلطنتِ رومہ اور یونان میں بھی اس کے آثار اور شواہد ملتے ہیں۔ اسی طرح کے شواہد اسلامی تاریخ میں بھی دیکھے

جا سکتے ہیں۔ خلافتِ راشدہ کے عہد میں بھی بد عنوانی قدیم نوعیت کی حامل تھی۔ تاریخ کی فرق گردانی سے ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں متعدد سرکاری افسران بدعنوانی کے مرتکب ہوئے۔ ان میں رابرٹ کلائیو(Robert Clive)، وارن ہسٹنگز(Warrn Hastings) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں کنگا گوند سنگھ مہراج نند کمار، امی چند اور جگٹ سیٹھ کے نام بھی بد عنوانی کی تاریخ سے منکشف ہوتے ہیں۔ یوں افسر شاہی یا سرکاری افسران کی بد عنوانی سفر طے کرتے ہوئے برِ صغیر پاک و ہند میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی وساطت سے پہنچی لیکن اس دور میں بھی اس کا خاتمہ نہ ہو سکا۔ برطانوی عہد میں بھی افسر شاہی کی قباحتوں اور بد عنوانی نے اپنی ساکھ کو مضبوط بنا لیا۔ یوں تشکیلِ پاکستان تک بد عنوانی کسی نہ کسی شکل میں سرکاری ملازمتوں میں موجود تھی۔ نو آبادیاتی عہد میں بھی بد عنوانی کے پسِ پردہ رہنے کے کچھ محرکات تھے جس کی وجوہات میں اعلیٰ افسران کا قبائلی دباؤ سے مبراء ہونا، تقابل اور ترغیبات کا فقدان، اعلیٰ افسران کا ماتحت افسران پر انتظامی اختیار اور روایتی قوت برداشت کی مضبوطی جیسے عناصر کی موجودگی تھی۔ سنٹرل ویجیلینس کمیشن (Central Vigilance Commision) کو مطابق بد عنوانی نے مابعد نو آبادیاتی عہد میں نچلی سطح سے مقتدر طبقات تک سفر کیا اور بیوروکریسی بھی اس کے زیرِ اثر آ گئی۔ زیرِ نظر مقالے میں سرکاری ملازمتوں میں پائی جانے والی قباحتوں اور بد عنوانی کے رجحانات کو مدِ نظر رکھ کر افسر شاہی میں نظام کی قباحتوں اور افراد کی بد عنوانی کا مطالعہ و مشاہدہ کیا گیا۔ اس مشاہدے اور مطالعے سے جو حقیقت واضح ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ افسر شاہی میں پائی جانے والی خامیوں کی دو صورتیں ہیں اولاً نظام کی قباحتیں ثانیاً افراد کی بد عنوانی۔ اس کے مطابق اپنے تئیں تمام پہلوؤں کی تشریح و توضیح کی گئی جس میں مجوزہ موضوع سے متعلقہ متعدد صورتیں عیاں ہوئیں۔ پہلی صورت میں افسر شاہی میں نظام کی قباحتوں کو منتخب کیا گیا جبکہ دوسری صورت میں افراد کی بد عنوانی کی صورتوں میں تین پہلوؤں کو احاطہ تحریر میں لایا گیا۔ موضوع تحقیق میں شامل افسر شاہی کی تفہیم دو پہلوؤں کے حوالے سے کی گئی جبکہ افراد کی بد عنوانی کو چار حوالوں سے پیش کیا گیا جس میں رشوت، سفارش، اقربا پروری اور سازش موضوع بحث رہے۔ ان تمام پہلوؤں کی تفہیم اور تنقیدی جائزہ لینے کے لیے تحقیقی مقالے کو چار ابواب میں منقسم کیا گیا۔ پہلے باب کا عنوان ''موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث'' ہے۔ اس کو مزید ذیلی عنوانات 'افسر شاہی کا تعارف'، 'افسر شاہی کی خوبیاں'، 'افسر شاہی کی قباحتیں (نظام میں قباحتیں، افراد کی بد عنوانی)'، 'اردو ناول میں افسر شاہی کی قباحتوں کی عکاسی کی روایت' میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دوسرے باب کا عنوان ''افسر شاہی میں نظام کی قباحتیں اور معاصر اردو ناول میں ان کی عکاسی'' ہے۔ جس کی مزید وضاحت اور تشریح و توضیح کے لیے افسروں

کو ان پڑھ سیاسی لوگوں کے ماتحت کرنا، نظام کی سست روی اور فائلوں کے گورکھ دھندے جیسے ذیلی عنوانات میں منقسم کیا گیا جبکہ اردو ناول میں ان قباحتوں کی عکاسی تین منتخبہ ناولوں 'پری'، 'کرک ناتھ' اور 'منتارا' کے ذریعے کی گئی۔ تیسرا باب افراد میں بدعنوانی کی صورتوں رشوت، سفارش، اقربا پروری اور سازش پر مشتمل ہے۔ان ذیلی عنوانات کے پہلوؤں کی عکاسی منتخبہ ناولوں کے ذریعے کی گئی، چوتھا باب مجموعی جائزہ، تحقیقی نتائج اور سفارشات کا حصہ ہے۔

پہلے باب میں افسر شاہی کا مفہوم اور تعارف پیش کیا گیا ہے جس میں اس کی ارتقائی صورت کو بھی سپردِ قلم کیا گیا اور اس کے پس منظر میں کارفرما تمام عناصر اور عناصر کو تحقیق کا جزو بنایا گیا۔ان تفہیمات کی روشنی میں افسر شاہی کی قباحتوں اور بدعنوانیوں کے تشکیلی عناصر واضح ہوتے ہیں جو عہد بہ عہد پروان چڑھتے ہوئے دورِ حاضر تک سفر طے کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان تمام عوامل کی عکاسی اور ناول میں مختلف ادوار سے گزرتی ہوئی عصرِ حاضر کے ناولوں کا جزو بنی۔اس ضمن میں افسر شاہی کی عکاسی کی روایت کو بھی موضوع تحقیق بنایا گیا۔اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ ادب کی صنف 'ناول' ایک وسیع النظر صنف ہے اور اس میں سماج کے تمام رویوں کی عکاسی ناول کے ذریعے کی جاتی ہے۔

عموماً یہ عوامی تاثر بھی مشاہدے میں آتا ہے کہ عصرِ حاضر میں مروجہ ضلعی سطح پر ملازمتوں کے حصول کے ضمن میں جو نظام قائم ہے اس میں قوانین و ضوابط کے متعدد مسائل سیاسی دشمنیوں کی بدولت جنم لیتے ہیں۔ایسی سیاسی شخصیات جن کے ہاں اپنا ایک مستحکم مؤقف ہو ان سے کسی دوسرے سیاسی کو حامل افراد کے لیے انصاف کی تمنا بے معنی ہو جاتی ہے۔اس نقص کی بدولت اکثر اوقات اعلیٰ افسران کو کم پڑھے لکھے سیاسی افراد کے ماتحت ملازمت دی جاتی ہے۔ جس کی ایک مثال ضلعی سطح پر ایک ایسے کلرک کو DC (ڈپٹی کمشنر) کا افسرِ اعلیٰ بنا دینا ہے جس کو بلدیاتی کونسلرز کی اکثریت حاصل ہو جس کے ردِ عمل کے طور ہر بدعنوانی، نااہلی اور نا انصافی جنم لیتی ہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ جب احتسابی عمل کا فقدان ہو۔اس منفی پہلو کے علاوہ افسر شاہی میں نظام کی سست روی بھی عوام الناس کے لیے پریشانی کا باعث بنتی ہے۔ جس کا ذکر زیرِ تحقیق مقالے کے دوسرے باب میں کیا گیا ہے۔اس کی ایک بنیادی وجہ نو آبادیاتی عہد سے پروان چڑھنے والا ایک روایتی طرز کا نظام ہے جس میں مقاصد کے حصول کو اولین ترجیح نہیں دی جاتی بلکہ روایتی ضابطوں اور طریقہ کار کے مطابق تمام امور سست روی سے انجام پاتے ہیں۔اس روایتی طرز کی ایک اہم مثال سرخ فیتہ (Red Tape)

ہے۔چونکہ سرکاری محکموں میں کارکردگی کی نگرانی کا نظام بہت کم فعال نظر آتا ہے جس کی بدولت اس طریقہ کار کو مزید استحکام ملتا ہے۔یہ اصطلاح سرکاری دفاتر میں ضابطے کی کاروائی میں التوا پیدا کرنے کی غرض سے غیر ضروری تاخیر کے پیشِ نظر مستعمل ہے۔اس کا مشاہدہ سماج میں اکثر و بیشتر ہوتا ہے۔تاریخ کی ورق گردانی سے یہ امر عیاں ہوتا ہے کہ ازمنہ قدیم میں اس کا استعمال ضروری اور انتظامیہ کو جدید اصولوں پر استوار کرنے کے لیے کیا گیا۔سولہویں صدی کے آغاز میں یہ طریقہ کار ہسپانوی سلطنت اور سلطنت رومہ میں رائج تھا جس میں ایسے تمام امور جو فوری فیصلہ سازی کے متقاضی تھے ان کو ایسے تمام امور سے الگ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا جن کے لیے عمومی ضابطے کی کاروائی درکار تھی۔عمومی ضابطے کی کاروائی کے متقاضی امور کو عام پٹی میں باندھ کر امتیاز پیدا کیا جاتا تھا۔یہ طریقہ کار سترہویں اور اٹھارویں صدی تک مروج رہا۔جبکہ بیسویں صدی کے آخر اور اکیسویں صدی کے آغاز سے ہی سرکاری افسران کے ہاں کمپیوٹر اور دیگر جدید ٹیکنالوجی کے استعمال نے رواج پکڑا جس سے تمام سرکاری امور اور ضابطے کی کاروائی ان جدید اصولوں کے مطابق عمل میں لائی جاتی۔مگر اس کے باوجود قدیم ہسپانوی دور کی روایات کو برقرار رکھا گیا۔مذکورہ صدی کے اوائل میں ہسپانوی طرز کے طریقوں کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا کیونکہ اس سے بہت سے معاملات غیر ضروری التوا کا شکار دکھائی دیتے جو کہ عوام الناس کے لیے پریشانی کا باعث بنتے۔تاہم اگر اس مروجہ اصطلاح کو وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلو مطمع نظر بنتے ہیں۔مثبت پہلو یہ ہے کہ سرخ فیتہ (Red Tape) معاملات کی نگرانی اور اس میں توازن کو برقرار رکھنا مقصود ہوتا۔سرخ فیتے کی میراث کے طور پر ملنے والی اصطلاح بذاتِ خود بری نہیں بلکہ اس کو غلط اور منفی طریقوں سے اس کا اطلاق کیا گیا۔جس کی بدولت سماج پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے چلے گئے جبکہ ضابطے کی کاروائی کے اصول و قوانین کا سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں پر اس کا اطلاق ہے۔کیونکہ ترقی پذیر ممالک میں یہ اصول و قوانین کمزور پالیسی سازی کی بدولت ناکام ثابت ہوتے ہیں اور سرخ فیتہ التوا کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔

نظام کی قباحتوں کے ضمن میں ایک تاریک پہلو فائلوں کے گورکھ دھندے بھی ہے۔ہمارے سماج میں دفتری سطح پر یہ نظام مروج ہے۔یہ دفتری نظام فائلوں کے انبار میں الجھا ہوا اور دبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔جس کو اب تک استحکام ملا ہوا ہے۔اس مروجہ نظام کی بدولت بسا اوقات ایسی فائلیں بھی اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتیں جن پر کوئی ضروری ہدایت درج ہو۔اس بوسیدہ نظام سے چھٹکارا حاصل کرنا از حد ضروری ہے۔عموماً یہ نقطہ نظر

بھی تحقیق کی بدولت مشاہدے کا جزو بنا کہ سیاسی نظام،افسر شاہی اور سرمایہ دارانہ نظام کے باہمی جوڑ سے فائلوں کا تبادلہ ذاتی مفاد کے حصول کو ممکن بناتا ہے۔اس تمام سماجی صورتحال کی عکاسی ہمارے عہد کے ناول نگار اپنے ناولوں میں بھی کرتے ہیں کیونکہ جب فن نے تہذیب کی گود سے جنم لے کر پیرائیہ اظہار اختیار کیا تو ادب اس کے اظہار کی صورت کا اہم وسیلہ ثابت ہوا۔ادب اپنے ارد گرد کے ماحول اور معاشرے کی عکاسی کا فریضہ سر انجام دیتا ہے۔جوں جوں سماج میں تغیر و تبدل کا قیام ہوا توں توں ادب بھی اس کے متشکل ہوتا گیا۔یوں کہا جائے تو بے جانہ ہو گا کہ ادب بھی سماج کی طرح تغیر پذیر ہے۔ادب چونکہ ادیب کی وساطت سے تخلیقی پیراہن حاصل کرتا ہے اس لیے ادیب سماج کا ایک حساس فرد متصور کیا جاتا ہے۔انسانی زیست کے تشکیلی مراحل میں کئی عناصر کار فرما ہوتے ہیں جن میں داخلی اور خارجی عناصر شامل ہیں۔ان دونوں عناصر کو ادیب اپنی تحریروں میں شامل کرتا ہے۔ادب کی صنف 'ناول' زندگی کی تمام جدوجہد، باہمی کشمکش، ناکامیوں اور کامیابیوں کا آئینہ دار ہوتا ہے جو کہ خیالی یا تصوراتی نوعیت کا حامل نہیں ہوتا بلکہ حقیقی اور عملی نوعیت کا ہوتا ہے۔جو پہلو اس تمام بحث و مباحثے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے وہ ناول نگار کا نقطہ نظر ہے۔مجوزہ تحقیق میں اسی نقطہ نظر کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ قرار دی جاسکتی ہے۔جس کے لیے تین ناولوں کا انتخاب کیا گیا۔یہ تین ناول محمد حفیظ خان کا ''کرک ناتھ''(۲۰۲۰ء)، ''منتارا''(۲۰۲۱ء)اور خالد فتح محمد خان کا ''پری''(۲۰۰۶ء) ہے۔

اکیسویں صدی کے آغاز ہی سے وقت کی برق رفتاری، مصنوعی طرزِ حیات،اقتدار و اختیار کے حصول اور پیچیدگیوں نے دورِ حاضر کی زندگی کے اطوار کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔اخلاقی اقدار، عزت و تکریم اور سماجی مرتبے کے اوزان بدل کر رہ گئے۔ہر چیز کو دولت اور اقتدار کے ترازو میں رکھ کر پرکھا جانے لگا ہے۔جس کی بدولت سماج میں چہار سو استحصال، ناانصافی اور خود غرضی نے جڑیں مضبوط کر لیں۔یہی رویہ اور طرز افسر شاہی کے ضمن میں سرکاری عہدیداروں کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔وہ اپنے فرائض منصبی سے بے اعتنائی برت کر دولت کی رنگینیوں میں کھو چکے ہیں۔نتیجے کے طور پر بدعنوانیاں اور بدیانتیاں معمولِ زندگی بن چکی ہیں۔یہ تمام حقائق ایک ناول نگار اپنے نقطہ نظر کے ذریعے ناول کے وسیع پیرائے میں ڈھال دیتا ہے جو سماج کی چلتی پھرتی تصویر دکھائی دیتا ہے۔جس سے صفحہ قرطاس کا دامن بھر جاتا ہے۔محمد حفیظ خان نے عہد حاضر میں منظرِ عام پر آنے والے ایک شہرہ آفاق ناول بعنوان ''کرک ناتھ'' میں کیا ہے۔یہ ناول اپنے عنوان اور موضوع کے اعتبار سے ایک ایسا ناول ہے جس میں انہوں نے ماہرانہ تفکر کی بدولت افسر شاہی کی قباحتوں کو فرضی کرداروں کی

بدولت صفحہ قرطاس کو درخشاں کیا۔ان کے فرضی کردار جمود کا شکار نہیں ہیں بلکہ متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ناول کا آغاز ہی ایک ایسے پر سوز جملے سے کیا گیا ہے جس سے چاروں طرف پھیلی سیاہ تاریکیوں میں کسی کواڑ سے روشنی کی چھوٹی سی کرن کے آنے کی امید ابھی باقی ہے۔ناول کا موضوع استعاراتی نوعیت کا حامل ہے جو سماج میں پھیلی ہوئی استحصالی کیفیت، بدعنوانیوں اور ناانصافیوں کا مظہر ہے۔جب کسی سماج میں اخلاقی اقدار اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہوتی ہیں تو ایک نئے اور درخشاں باب کا آغاز ہوتا ہے۔محمد حفیظ خاں سرکاری نظام کا ایک اہم حصہ رہ چکے ہیں جس کی وجہ سے وہ اس نظام کے عینی شاہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔معاشرے میں پھیلی ناانصافیوں اور بدعنوانیوں کو انہوں نے ناول کے حسین پیرائے میں ڈھال دیا ہے۔انہوں نے زیرِ جائزہ ناول میں ایک ایسے بااختیار اور مقتدر طبقے سے تعلق رکھنے والے کردار کو بیان کیا ہے جس کا تعلق ناول میں متذکرہ تمام ناانصافیوں اور ظلم و بربریت سے ہے۔ناول کے تمام واقعات اسی ناقابلِ شکست شخصیت کے گرد گھومتے ہیں۔ناول ہذا میں افسر شاہی میں نظام کی ایک اہم خامی نظام کی سست روی کا عکس جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔زیرِ تحقیق ناول کا ایک مرکزی کردار ''ذفیرہ احمد'' کا ہے جو کہ اس بااختیار کردار کی سازشوں کے بھنور میں پھنس جاتی ہے۔اسے کہیں سے بھی فرار کی راہ دکھائی نہیں دیتی کیونکہ بڑے صاحب اس کے گرد سازشوں کا ایک ایسا جال بنتا ہے کہ ذفیرہ احمد سرتاپا اس میں جکڑی جاتی ہے اور اپنی کاروباری ساکھ بھی کھو دیتی ہے۔اس کو تمام راستے مسدود اور تمام انصاف دلانے والے ادارے جمود کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔اس کی عملی شکل اسے میڈیا کی وساطت سے دکھائی دیتی ہے جس میں افسر شاہی بھی شامل ہے۔یوں افسر شاہی میں سست روی کے شواہد ملتے ہیں۔ناول میں افسر شاہی کے ایک اور منفی پہلو کی عکاسی بھی کی گئی ہے جو کہ فائلوں کے انبار کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔کاروباری سطح پر بہت سے امور افسر شاہی کے دفتر میں اجازت ناموں کی منظوری نہ ہونے کی صورت میں فائلوں میں موجود ہیں۔دانش سعید کا کردار بھی کچھ ایسی صورتحال سے دوچار نظر آتا ہے، علاوہ ازیں زیرِ بحث ناول میں بے شمار ایسے واقعات کا حوالہ موجود ہے۔

ناول 'نتارا' کی کہانی کے تار و پود میں ایسے متعدد فرضی کردار ہیں جو سیاسی نظام اور افسر شاہی کی غلام گردشوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔اس ناول کے تمام کرداروں میں جذباتی وابستگی کم اور مفاد پرستی زیادہ نظر آتی ہے جو کہ دورِ حاضر کے سماج کا ایک المیہ ہے۔زیرِ نظر ناول کے کردار میں مخدوم ناظر حیات، فرحان، صباحت، نائلہ، چوہدری کبیر حسین، منصور قریشی، مخدوم زادہ ہادی

حیات، کشور النساء، سریندر اور سلمیٰ حیات کے کردار کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔اس سیاسی اقتدار کے حصول کے کھیل میں افسر شاہی کے ایک پہلو فائلوں کے انبار کی صورت میں عکاسی ہوتی ہے۔اس میں حکومتی سطح پر فائلوں کا وہی روایتی طور آج بھی اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہے۔وزیرِ اعظم سیکریٹریٹ میں فائلیں ایک ڈھیر کی شکل میں موجود ہوتی ہیں جن میں بسا اوقات ایسی فائلیں بھی اپنی شناخت کھو بیٹھتی ہیں جن پر وزارت کی جانب سے کوئی اہم ہدایت درج کی گئی ہو۔متذکرہ ناول میں فائلوں کے انبار میں اس امر کی بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ بہت سے اہم معاملات جو فوری کاروائی کے متقاضی ہوتے ہیں کچھ وجوہات کی بناپر فائلوں کی نظر کر دیے جاتے ہیں۔

زیرِ تحقیق مقالے کا تیسرا باب افسر شاہی میں افراد کی بد عنوانی کی صورتوں اور معاصر اردو ناول میں ان کی عکاسی کا احاطہ کرتا ہے۔اس کے موضوع تحقیق میں افراد کی بد عنوانی کی صورتوں رشوت، سفارش، اقربا پروری اور سازش کی تفہیم وادراک کو پیش کیا گیا ہے۔ان تفہیمات کا تنقیدی مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ اردو ناول میں ان کی عکاسی کا مطالعہ بھی باریک بینی سے کیا گیا ہے۔زیرِ تحقیق معاصر ناولوں کے تمام واقعات اور کردار بد عنوانی کی متذکرہ صورتوں کے حوالے سامنے آتے ہیں۔جب افسر شاہی کی کاری ضربیں سماج پر لگ رہی تھیں تو اس وقت سیاسی سطح پر آمرانہ طرزِ حیات کے رجحان کو فروغ حاصل ہوا جس سے جمہوری اقدار اور سماجی انصاف کی پامالی کا رواج زور پکڑتا گیا۔سماجی ناانصافی کا سب سے بڑا محرک رشوت ستانی کی صورت میں منظرِ عام پر ظاہر ہوا۔رشوت کے اصطلاحی مفہوم سے افہام و تفہیم کا یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ رشوت ایک ایسی چیز ہے کہ ایک آدمی محض اس لیے دیتا ہے کہ یا تو اس کے حق میں فیصلہ صادر کیا جائے یا بصورتِ دیگر اسے کسی منصب پر فائز کر دیا جائے۔رشوت ایک ایسی چیز کو بھی گردانا جا سکتا ہے کہ جو کوئی بھی مستحق کسی حاکم یا غیر حاکم کو اپنے ذاتی مفاد کے حصول کی خاطر دیتا ہے۔وہ حاکم یا غیر حاکم حکمران بھی ہو سکتا ہے اور کسی سرکاری محکمے کا ملازم بھی۔افسر شاہی کے حوالے سے رشوت کی متعدد اشکال ہیں جو کہ ہمارے سماج میں مروج ہیں۔ایک صورت یہ بھی ہے کہ رشوت ایک ایسی رقم ہے جو ایک سرکاری افسر اپنے سرکاری عہدے کی وجہ سے کسی ایسے آدمی سے وصول کرتا ہے جس کا کوئی کام اس کے پاس رکا ہوا ہوتا ہے۔اس طرح ایک سرکاری افسر کسی شہری کی مجبوری سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔حالانکہ وہ اس چیز کا حقدار نہیں ہے۔کیونکہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے عوض حکومت سے معاوضہ وصول کرتا ہے۔کسی بھی سرکاری ملازم کے لیے ایسی رقم جو بطور ہدیہ وصول کی جاتی ہے

وہ خیانت میں شمار ہوتی ہے اور خیانت اسلامی نقطہ نظر سے حرام قرار دی گئی ہے۔ سماجی نقطہ نظر سے رشوت ستانی کے جو مضر اثرات مرتب ہو رہے ہیں ان کا مکمل احاطہ اس مختصر مقالے میں مشکل تھا۔

سفارش جیسی بد عنوانی کی کیفیت بھی سماج میں کچھ ایسی ہی ہے۔ سفارش کی بنا پر حق دار کو اس کے جائز اور شرعی حق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ اس طرح معاشرہ بے یقینی اور بے اعتمادی کا شکار ہو جاتا ہے اور متعدد برائیاں اپنا وجود قائم کر لیتی ہیں۔ انتظامی سطح پر بھی تعلقات اور سفارش جیسے عناصر کو اولین ترجیح حاصل ہے۔ کسی بھی ملک کی ترقی و خوشحالی کے لیے انتظامیہ کو ریڑھ کی ہڈی متصور کیا جاتا ہے لیکن اس میں سفارش جیسی بد عنوانی کو اس قدر فروغ حاصل ہو گیا ہے کہ جس سے انصاف کا حصول ایک قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ یہ صورتحال کئی دوسرے ایشیائی ممالک میں بھی موجود ہے۔ مقتدر طبقات نے پاکستان میں برطانوی طرز کی استحصالیت اور نو آبادیت کو استحکام بخشا ہے۔ ہمارے انتظامی ڈھانچے میں سفارش کے مرتکب افراد کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاتا کیونکہ ان میں سے اکثریت کو حوصلہ افزائی حاصل ہوتی ہے۔ اس مقام پر انسانی ضمیر بھی کہیں گھٹاٹوپ اندھیروں میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انسان احکاماتِ خداوندی کو بھلا بیٹھا ہے۔ سفارش کے حوالے سے دورانِ تحقیق بہت تلخ حقائق سامنے آئے ہیں۔ یہ جملہ بھی عوام کی زبان سے سننے کو ملتا ہے کہ سفارش سرکاری دفاتر میں کافی مقبول ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تاثر درست ہے یا محض جذباتی خیال؟ دنیا کے اکثر خطوں میں عوام الناس کو یہ کامل یقین ہے کہ سفارش انتظامی زندگی کا ایک لازمی جزو بن چکی ہے۔ سفارش ہمارے سماج کے رگ وپے میں سرایت کر چکی ہے۔ سفارش کی وجہ سے عوام کو اپنا روشن مستقبل تاریک دکھائی دیتا ہے۔ سفارش جیسے موذی مرض کی داستانیں اخلاقی اقدار کو شکستِ فاش دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ سفارش نہ صرف مقتدر طبقات کا اصولِ زندگی ہے بلکہ ایسی ہمہ گیر لعنت ہے جس نے ملکی انتظامی ڈھانچے کو محصور کر لیا ہے۔ یہ اندیشہ بھی منڈلاتا نظر آتا ہے کہ پاکستان میں سفارش کی شرح میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے تاحال سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں سفارش تنزلی کا باعث ہے۔ اس خدشے اور اندیشے کو عوام کی تائید حاصل ہے۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ قائم رہی کہ برطانوی دور کے وضع کردہ اصول وضوابط بھی سفارش اور بد عنوانی کا خاتمہ کرنے میں بار آور ثابت نہ ہو سکے۔ ایک آئین کی رو سے سفارش ہمارے اس معاشرے میں اس قدر اپنی جڑیں مضبوط کر چکی ہے کہ اس کے خاتمے کے لیے ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہے۔

افراد کی بد عنوانی کی صورتوں میں سے ایک صورت اقربا پروری بھی ہے۔اقربا پروری ماضی کی ذاتوں اور قبائلی اداروں کا نتیجہ ہے۔یہ اقربا پروری سرکاری ملازمتوں میں بھی در آئی ہے۔دورِ حاضر میں ہمارے سماج کی جڑوں کو جن عوامل نے کھوکھلا کر دیا ہے ان میں سے سب سے مہلک 'اقربا پروری' ہے۔معاشرے میں اقربا پروری سے ہی نااہلی جنم لیتی ہے جس کی وجہ سے معاشرے میں ذہانت، قابلیت اور اہلیت اپنے تئیں خود شرمسار محسوس کرتی ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے اقربا پروری نے ہمارے معاشرے میں اپنے قدم جما لیے ہیں۔اگر اس میں ناانصافی کا پہلو بھی شامل ہو جائے تو یہ بے ایمانی گردانا جاتا ہے۔دنیا کے کئی دوسرے ممالک میں بھی اقربا نوازی، خویش پروری یا طرفداری اخلاقی اقدار کے مدِّمقابل ہے۔اقربا پروری محرومی پر منتج ہے۔جب قابل اور ذہین افراد کو ان کے جائز حق سے محروم رکھا جاتا ہے تو احساسِ محرومی اجاگر ہوتا ہے۔بیوروکریسی میں ان بد عنوانیوں کی موجودگی نوآبادیاتی عہد کی تنگ نظری کی جھلک ہے۔اکیسویں صدی کے ناول اس کے بھرپور عکاس ہیں۔خالد فتح محمد کے زیرِ تحقیق ناول 'پری' میں بھی اس طرح کے بہت سے عوامل کی منظر کشی موجود ہے۔ناول کے مرکزی کردار معظم علی خان پر افسر شاہی اور سیاسی نظام کی نوآبادیاتی ذہنیت اور اطوار عبدالمجید کے ذریعے آشکار کیے جاتے ہیں جو کہ ایک ماہر سیاستدان ہے۔ معظم علی خان کو یہ بتایا جاتا ہے کہ صنعتی ترقی کے دور میں مجموعی قومی مفاد کی بجائے انفرادی مفادات کو ترجیح دی گئی جس کی بدولت صنعتی ترقی تنزلی کی جانب بڑھنے لگی۔ملک قرضوں کی لپیٹ میں آگیا جو کہ کسی بھی نوزائیدہ ریاست کے لیے خطروں کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ان تمام نامساعد حالات میں امریکہ نے ہماری ملکی معیشت کو استحکام بخشنے کے لیے قرضوں کی فراہمی کا سلسلہ شروع کیا اور ملک تنزلی کی راہ پر چل نکلا۔یہ غیر ملکی امداد کچھ اقربا نوازی، کچھ رشوت کی صورت میں جائز مقاصد کے لیے استعمال نہ ہو سکی۔اسی قسم کے حالات کی عکاسی محمد حفیظ خان کے ناول 'کرک ناتھ' میں بھی کی گئی ہے۔اس ناول میں ناول نگار افسر شاہی سے جڑے ہوئے مختلف قسم کے استحصال اور جبر واستبداد کو ظاہر کرتا ہے۔استحصال زدہ اور استحصال کنندہ کی یہ چپقلش نوآبادیاتی دور سے چلی آرہی ہے، زیرِ نظر ناول میں رشوت جیسے ظلم کی عکاسی مرکزی کردار 'بڑے صاحب' کی صورت میں کی جاتی ہے۔ناول میں انتہائی بے باکی سے اپنے اس جرم کا اعتراف کرتا نظر آتا ہے۔اس کے مطابق وہ رشوت کی بدولت اپنی مرضی کے تمام مفادات کا حصول ممکن بنا سکتا ہے۔اس کی پہنچ تمام شعبہ ہائے زندگی پر حاوی دکھائی دیتی ہے۔رشوت کی بدولت وہ بلیک میلنگ جیسے گھناؤنے جرم کا بھی مرتکب ہوتا ہے۔متذکرہ ناول میں اس پہلو کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے کہ کس طرح افسر شاہی کے مقتدر افراد پسِ پردہ رہ کر اپنے مفاد کے حصول کو اپنے لیے ممکن بناتے ہیں۔اس قسم کے رجحان کی

عکاسی 'بڑے صاحب' دانش سعید (جو کہ کاروباری دنیا کا ایک اہم نام ہے) کے روبرو بھی کرتا ہے۔ جب وہ ذفیرہ احمد کی جانب سے بھیجی گئی فوٹیج کو آن ایئر نہ ہونے کے اسباب بتاتا ہے۔ رشوت کے ساتھ ساتھ اقربا پروری کی عکاسی بھی منتخبہ ناولوں میں کی گئی ہے۔ جس میں ناول 'پری' میں خصوصاً یہ پہلو موجود ہے کہ کس طرح سیاست دان اپنے مذموم مقاصد کے لیے بیوروکریٹوں کو استعمال کرتے ہیں جن کی بدولت بعض خاندانوں کا تعین کیا جاتا ہے اور تمام تر مراعات انہیں خاندانوں کے گرد گھومتی ہیں۔ سازش کے پہلو کی عکاسی بھی محمد حفیظ خان کے دونوں زیرِ تحقیق ناولوں میں کی گئی ہے۔ ناول 'کرک ناتھ' میں مرکزی کردار بڑے صاحب ہر طرف اپنی سازشوں کا جال پھیلاتا ہے۔ جس میں ذفیرہ احمد بری طرح پھنس کر رہ جاتی ہے جو کہ کسی قیدی پرندے کی مانند آزاد ہونے کے لیے پھڑ پھڑاتی ہے مگر فرار حاصل نہیں کر سکتی۔ کہانی کے تار و پود میں تقریباً سبھی کردار بڑے صاحب کی سازشوں کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے ہمارے مروجہ افسر شاہی نظام میں مختلف نوعیت کی ریشہ دوانیوں کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ ذفیرہ احمد اپنی اشتہاری کمپنی کو دیوالیہ ہونے سے بچانے کے لیے بڑے صاحب کی معاونت حاصل کرتی ہے۔ یوں اس کی ناکامیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ زیرِ جائزہ ناول میں افسر شاہی کے ضمن میں ہونے والے استحصال کی مختلف جہتیں بیان کی گئی ہیں۔ افسر شاہی اور سیاست کا گٹھ جوڑ سماجی استحصال کا موجب بنتے جا رہے ہیں جو کہ آج کے دور کا ایک بہت بڑا المیہ بھی ہے۔ یہیں سے ناول نگار کی مستقبل پر گہری نظر کا اظہار ہوتا ہے۔

تشکیلِ پاکستان کے فوراً بعد حکومتی اور انتظامی امور کو صحیح معنوں میں چلانے کے لیے ایک مشینری کی ضرورت تھی اور وہ مشینری افسر شاہی تھی۔ سیاستدانوں کے وجود کے باوجود افسر شاہی ہی قوانین و ضوابط کے تشکیلی مراحل کو پورا کرتی ہے۔ حقیقت میں افسر شاہی کا عمل دخل سیاست میں بھی ہے۔ افسر شاہی کو سیاستدانوں کی ہوس کا بخوبی ادراک ہے اور وہ ان کی اس کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھاتی ہے۔ اس قسم کے المیے کی عکاسی محمد حفیظ خان کے ناول 'نتارا' میں کی گئی ہے۔ مخدوم ناظر حیات کا کردار ایک ایسا کردار ہے جو کہ سیاستدانوں اور افسر شاہی دونوں کے مذموم مقاصد کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے کئی ایک کردار اس میں آلۂ کار کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ تمام کردار مقتدر طبقات کی سازشوں کا شکار ہو کر صرف ایک مہرے کی صورت میں استعمال ہوتے ہیں۔ نائلہ کے کردار کی دلی اور ذہنی کیفیت اس سازش کی آئینہ دار ہے۔ مخدوم ناظر حیات کی استفساری کیفیت اور ذہنی الجھاؤ سے تمام صورتِ احوال کا جائزہ لیا جا سکتا

ہے۔یوں کہنا بے جانہ ہو گا کہ تمام ملکی انتظامات افسر شاہی کی کی مدد کے بغیر ناممکن ہیں۔زیرِ نظر ناول میں سازشوں کا جال ہر طرف بچھا ہوا ہے۔

ب۔ تحقیقی نتائج

اس تحقیق سے حاصل ہونے والے نتائج نکات کی صورت میں ذیل میں مرتب کیے گئے ہیں:

- اردو ناول میں جن سماجی مسائل کا تذکرہ تواتر سے ملتا ہے،ان میں اکثر کی وجوہات تلاش کی جائیں تو کسی نہ کسی حوالے سے افسر شاہی نظام سے اس کا تعلق ضرور سامنے آتا ہے۔یوں اس تحقیقی کام کے ذریعے دیگر سماجی مسائل کی عکاسی اور اس کے تجزیے کے بارے میں کیے جانے والے تحقیقی کاموں کو ایک بنیاد فراہم ہوئی ہے جس کے ذریعے جملہ سماجی مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے جب ان کی وجوہات کا ذکر آئے گا تو افسر شاہی کی قباحتوں کا حوالہ بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہو گا۔
- زیرِ نظر تحقیق میں افسر شاہی کی قباحتوں کو دو حوالوں سے دیکھا گیا ہے جن میں ایک پہلو نظام میں موجود قباحتوں کا ہے اور دوسرا پہلو افراد کی پیدا کردہ قباحتوں کا ہے۔ مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو ناول نگاروں نے سماج کا جو چہرہ دکھایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے افسر شاہی سے متعلق مسائل میں نظام کی قباحتیں نسبتاً کم ہیں جبکہ افراد کے ناروا رویے زیادہ مسائل کا باعث بنتے ہیں۔ انصاف کی فراہمی، معاشی مساوات کی طرف پیش قدمی، عام آدمی کے مسائل کے حل کے بارے میں افسر شاہی نظام میں سہولیات اور گنجائشیں موجود ہیں لیکن افراد کی بدنیتی اور ذاتی مفادات کا لالچ انھیں عوامی بہتری کی اقدامات سے روکتا ہے۔
- ناولوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیرِ نظر ناول نگاروں نے افسر شاہی میں افراد کی بدعنوانی کی مختلف صورتوں کو اجاگر کرتے ہوئے جزئیات نگاری سے کام لیا ہے اور معاشرے میں رشوت خوری، اقربا پروری، سفارش اور سازشی میلان کی متنوع صورتوں کو سامنے لائے ہیں جن میں ایسی صورتیں

بھی ہیں جو ہمارے عام اور روزمرہ مشاہدے میں آتی ہیں لیکن ساتھ ہی کچھ صورتیں ایسی بھی ہیں جو بادی النظر میں قابلِ توجہ نہیں لگتیں لیکن غائر نظر سے دیکھنے پر ان کے قبیح پہلو آشکار ہوتے ہیں۔

- ناول نگاروں نے افسر شاہی نظام کی جن خرابیوں کی عکاسی اپنی تخلیقات میں کی ہے، وہ زیادہ تر دیکھی بھالی ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں نظام کی سُست روی ہے جس کے باعث محض وقت پر مکمل نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے اچھے کاموں کے نتائج منفی نکلتے ہیں۔ سب سے بڑی مثال نظامِ انصاف کی ہے جس میں تاخیر اس کے معدوم ہونے کے مترادف ہے۔ اس کے علاوہ اہل لوگوں پر نااہل لوگوں کی حاکمیت بھی نظام کی ایسی خرابی ہے جس کے باعث نظام کی برکتیں، زحمتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس نظام میں بعض جگہ فائلوں کے گورکھ دھندے ایسے ہیں کہ بعض اوقات چاہتے ہوئے بھی اس میں سرعت کا مظاہرہ نہیں کیا جا سکتا جس کی بنیادی وجہ اس نظام میں اصلاحات کی دیرینہ ضرورت سے پہلو تہی ہے۔ بنیادی طور پر نوآبادیاتی طرزِ حکومت کے لیے تشکیل دیا گیا یہ نظام ایسی اصلاحات کا متقاضی ہے جو اس میں اپنے ہم وطن افراد کے لیے ہمدردی اور خدمت کے پہلو کو شامل کر کے اسے مفید و مؤثر بنا سکے۔
- یہ بھی اندازہ ہوا کہ اس حوالے سے ناول نگاروں کا مشاہدہ عام آدمی کے مشاہدے کے متوازی ہے اور نظام کی خرابیوں کے حوالے سے اس گہرائی سے جزئیات نگاری نہیں کی گئی جیسی افراد کی بدعنوانی کے حوالے سے ناولوں میں ملتی ہے۔

ج۔ سفارشات

مذکورہ بالا تحقیقی نتائج کی روشنی میں درج ذیل سفارشات مرتب کی جاتی ہیں:

ا۔ بدعنوانی اور افسر شاہی میں نظام کی قباحتوں کے حوالے سے یونیورسٹی اور دیگر تحقیقی اداروں میں اس موضوع کے دوسرے پہلوؤں پر تحقیق و تصنیف کے منظم سلسلے کا آغاز ہونا چاہیے تاکہ عوامی سطح پر زیادہ سے زیادہ شعور کو ممکن بنایا جا سکے۔

۲۔افسر شاہی کی قباحتوں کے تناظر میں خالد فتح محمد کے منتخب ناولوں کا محمد حفیظ خان کے منتخب ناولوں کے ساتھ تقابل کیا جا سکتا ہے کیونکہ خالد فتح محمد کے ہاں افسر شاہی میں افراد کی بد عنوانی اور نظام کی قباحتوں میں نو آبادیاتی عہد کی روایتی تنگ نظری کی وجہ سے سماجی مسائل جنم لیتے ہیں۔ محمد حفیظ خان کے ناولوں میں بھی افسر شاہی ایسے مسائل اور حالات کی نمائندگی کرتی دکھائی دیتی ہے۔

۳۔ محمد حفیظ خان اور خالد فتح محمد کا اسلوب غیر معمولی نوعیت کا حامل ہے۔انہوں نے افسر شاہی کی بدولت جنم لینے والے سماجی مسائل کی عکاسی جس بے باکی اور قادر الکلامی سے کی ہے اس پر لسانی پہلو کے حوالے سے بھی تحقیق کی جا سکتی ہے۔

۴۔نصاب سازی کی سطح پر بھی زیرِ نظر تحقیق میں شامل افسر شاہی کے ضمن میں مختلف پہلوؤں کو شامل نصاب کرنا چاہیے تاکہ نصاب اور سماجی مسائل میں ہم آہنگی پیدا کی جا سکے۔نصاب کی سماج سے وابستگی اور ہم آہنگی ہی بنیادی طور پر تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے میں معاشرتی عمل کی افزائش کا کام کرتی ہے۔

۵۔افسر شاہی کے حوالے سے بد عنوانیوں کے انسداد کے لیے محکمہ انسداد رشوت ستانی اور اسلامی طرز حیات کا فروغ ضروری ہے تاکہ اس نو آبادیاتی عہد کے فرسودہ نظام سے چھٹکارہ حاصل کیا جا سکے۔

۶۔انتظامی محکموں میں منتظمیت کو جدید اصولوں کے مطابق بنانا چاہیے اور اس میں ہونے والے مؤثر اقدامات کا گاہے بگاہے جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔

۷۔افسر شاہی سے متعلقہ اداروں میں درستی کے اقدامات کے ضمن میں فنی تربیتی پہلو اور عمومی تربیتی پہلو کو مد نظر رکھنا چاہیے۔

۸۔خالد فتح محمد اور محمد حفیظ خان نے افسر شاہی کی قباحتوں جیسے اہم قومی مسئلے کی جانب توجہ مبذول کروانے کے ساتھ ساتھ جنسی استحصال اور تشدد جیسے دیگر سماجی مسائل کی نشاندہی بھی کی ہے۔تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ مذکورہ بالا ان ناول نگاروں کے ادبی کام پر اس تناظر میں تحقیق ہونی چاہیے تاکہ تحقیق کی روایت کو فروغ دیا جا سکے۔

۹۔ناولوں کے مطالعے اور مشاہدے کے بعد کہیں کہیں ڈرامائیت کی غرض سے مبالغے کا احساس ہوتا ہے جسے ناول نگاروں کو حقیقت پسندانہ رکھنا چاہیے۔

۱۰۔ منتخبہ ناولوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسر شاہی کی بدولت جنم لینے والے سماجی مسائل کے پس منظر میں بہت سے اسباب کار فرما ہیں۔ تاہم ان تمام پہلوؤں کو اب تک بے نقاب نہیں کیا جا سکا۔ اقتضائے وقت یہ ہے کہ خالد فتح محمد اور محمد حفیظ خان کی اس موضوع پر تحریروں کا مطالعہ و مشاہدہ کر کے رازوں کو منظر عام پر لایا جائے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

خالد فتح محمد، پری، برائٹ بکس پبلیشرز اینڈ بک سیلرز، لاہور، ۲۰۰۶ء

محمد حفیظ خان، کرک ناتھ، بک کارنر جہلم، پاکستان، ۲۰۲۰ء

محمد حفیظ خان، منتارا، صریر پبلیکیشنز، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء

ثانوی مآخذ

اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۹ء

امام ابنِ حزم اندلسی، المحلیٰ، مرکز الدعوۃ والارشاد، لاہور، جلد، ۲۰۰۹ء

اسلم آزاد، ڈاکٹر، اردو ناول آزادی کے بعد، سیمانتھ پرکاش، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء

ایڈورڈ سعید، شرق شناسی، محمد عباس (مترجم)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، س۔ن

امتیاز احمد، مقالہ نگار، اردو ناول: موضوعات واسالیب، ۱۹۶۰ء تاحال، شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، س۔ن

حافظ محمد سعد، رشوت، ایک لعنت، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، س۔ن

سید احتشام حسین، تنقیدی جائزے، احباب پبلشرز، الٰہ آباد، ۱۹۵۳ء

سید محمد عقیل، ڈاکٹر، نئی فکریں، خیابان پبلشرز، الٰہ آباد، ۱۹۵۳ء

سید محمد عقیل، ڈاکٹر، جدید ناول کا فن، نیا سفر پبلیکیشنز، الٰہ آباد، ۱۹۹۷ء

سید عابد علی عابد، اصولِ انتقادِ ادبیات، لاہور سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۶ء

سہیل بخاری، اردو ناول نگاری، مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۶۰ء

سنبل نگار، ڈاکٹر، اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، زبیر بکس اردو بازار لاہور، س۔ن

سید محمد حفیظ قیصر، سول سروسز اور بیوروکریسی، جلد اوّل، ممتاز پبلشنگ لاہور، ۲۰۰۷ء

شان الحق حقی (مترجم)، ارتھ شاستر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء

شمس الرّحمٰن فاروقی، تعبیر کی شرح، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء

شیخ حسام الدین فرفور، حاشیہ ابنِ عبدین، جلد ۵، دار امعرفہ، بیروت، لبنان، ۲۰۰۰ء

صالحہ زرین، اردو ناول کا سماجی وسیاسی مطالعہ (ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک)، ادارہ نیا سفر، الٰہ آباد، ۲۰۰۰ء

طاہرہ سرور، ڈاکٹر، عساکرِ پاکستان کی ادبی خدمات اردو نثر میں، لاہور اکادمیات، ۲۰۱۳ء

عنایت الہیٰ ملک، پاکستان میں انتظامیہ کا زوال، مشعل لاہور، ۲۰۰۰ء

عبداللہ بن عبدالمحسن الطریقی (مؤلف) مولانا نصیر احمد علی (مترجم)، رشوت، ایک معاشرتی ناسور، مکتبہ اسلامیہ، ۲۰۰۵ء

عبدالرؤف، ڈاکٹر، بدعنوانی اور رشوت ستانی، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء

قیصر امین الدین، فکر و نظر، ابلاغ، لاہور، ۱۹۹۹ء

محمد عامر سہیل، نوآبادیات و مابعد نوآبادیات (نظریہ، تاریخ، اطلاق)، عکس پبلیکیشنز، ۲۰۱۹ء

مشتاق احمد وجدی، مسئلہ ارتقاء، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، س۔ن

محمد علی خالد، جی۔ایچ۔کیو سیاست، مسیحا پبلیکیشنز، حیدرآباد، ۱۹۸۸ء

محمد رفیق شیخ، تاریخ پاکستان و ہند، سٹینڈرڈ بک ہاؤس، ۱۹۹۳ء

ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اردو ناول، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۸ء

محمد فرید وجدی، دائرۃ المعارف القرآن العشرین، تصویر دار المعرفہ، جلد ۱۷۱، ۴ء

مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، جلد ۳، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ۲۰۰۸ء

مخدوم زادہ سید حسن محمود، میرا سیاسی سفر، جنگ پبلشرز، ۱۹۸۶ء

م۔ب خالد، قدرت اللہ شہاب کے ساتھ ایوانِ صدر میں سولہ سال، احمد پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

ممتاز حسین ناول اور افسانہ، مشمولہ ۱۹۵۱ء کا بہترین ادب، برکت علی، مرزا ادیب (مرتبین)، مکتبہ اردو لاہور، اوّل، جولائی ۱۹۵۲ء

مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کی گواہی، تاریخ پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

محمد حمید شاہد، اردو فکشن: نئے مباحث، مثال پبلیکیشنز، فیصل آباد، ۲۰۱۵ء

محمد عامر سہیل، نوآبادیات و مابعد نوآبادیات (نظریہ، تاریخ، اطلاق)، عکس پبلیکیشنز، ۲۰۱۹ء

ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، فکشن ہاؤس، حیدرآباد، کراچی، س۔ن

ناصر عباس نیر، مابعد نوآبادیات اردو کے تناظر میں، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۱۳ء

نگینہ جبین، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ (۱۹۴۷ء اور اس کے بعد)، ۴۰۵۔اے۔دریاآباد پبلیکیشنز، الٰہ آباد

انگریزی کتب

Kiran Khurshid,A Treatise on Civil Service of Pakistan,The Structural-Functional History(1601-2011),Pak TM Printers,Faisalabad,2011

Micheal P.Barber,Revised by Roger Stacy,M4E International(Student Edition 1983),Service Book Club,1987

Micheal Crozier,The Bureaucratic Phenomenon,Transaction Publishers New Bruncwick(U.S.A) and London(U.K),1964

Pakistan Panel Code(KLV of 1860),1860

Syed Abdul Quddus,Bureaucracy and Management in Pakistan,Royal Book Company,1991

Sana Rauf,Effects of Red Tape in Public Sector Organization: A Study of Government Department in Pakistan,Published in Public Administration and Policy,Emeraled Publishing Limited,Vol.23

Tariq Masood,National Defence Cource Group Research Officer Good Governance,National Defence College,Islamabad,1999

رسائل و جرائد

سہ ماہی ادبیات، خصوصی نمبر: اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ، جلد اوّل، دوم، شمارہ نمبر ۲۴۔۱۲۳ اکادمی ادبیات پاکستان، جنوری تا جون ۲۰۲۰ء

ماہنامہ بک ڈائجسٹ، محمد حفیظ خان نمبر، جلد: ۱۷، شمارہ: ۳۔۴ اردو بازار لاہور، جولائی۔اگست ۲۰۲۰ء

ماہنامہ ادب دوست، جلد نمبر ۱۳، شمارہ نمبر ۵، لاہور، مارچ ۲۰۰۷ء

ماہنامہ، الحمراء، جلد نمبر ۷، شمارہ نمبر ۳، لاہور، مارچ، ۲۰۰۷ء

ہفت روزہ، الحبیب، جلد نمبر ۲۹، شمارہ نمبر ۷، لاہور، ۱۵ فروری ۲۰۰۷ء

مقالہ جات

محمد افضال بٹ، اردو ناول میں سماجی شعور، مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، نومبر ۲۰۰۶ء

مہ جبین، خالد فتح محمد کی ناول نگاری، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۷ء

نزاکت اقبال، لندن کی ایک رات (نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی مطالعہ)، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، نومبر ۲۰۰۶ء
نطاشہ مسعود، خالد فتح محمد کی ناول نگاری ('پری' اور 'خلیج' کے حوالے سے)، ۲۰۰۷ء تا ۲۰۰۹ء

لغات

سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۱۲ء
عبدالحمید، جامع اللغات، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۰ء
فیروزالدین، الحاج (مرتب)، فیروز اللغات اردو جامع، فیروز سنز، لاہور
کنسائز اردو ڈکشنری، اے۔ آر قریشی، الحسنات بکس پرائیویٹ لمیٹڈ
https://www.Collinsdictionary.com
https://Webster's New World College Dictionary
https://Dictionary.Cambridge.org